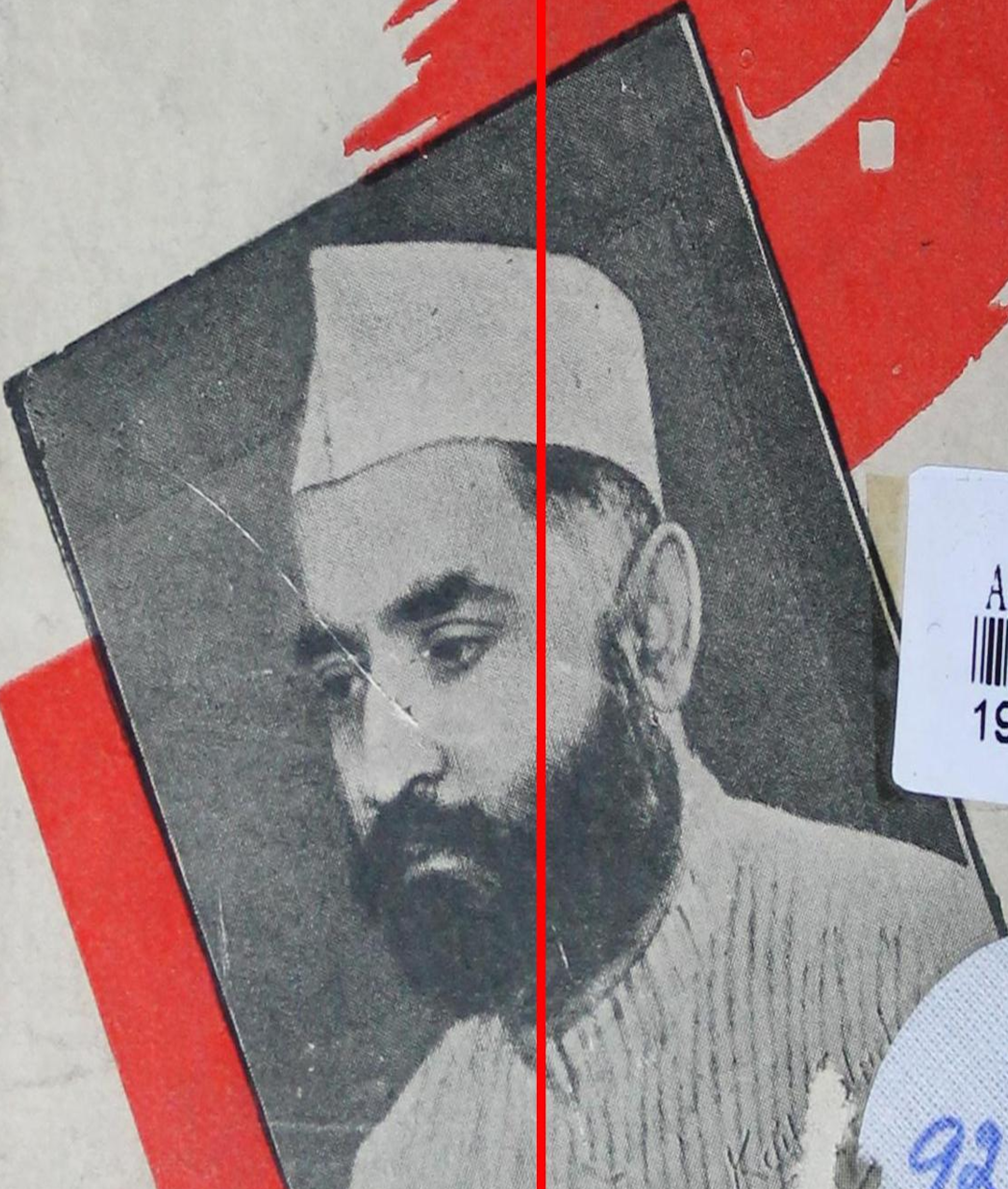
ذاکر صاحب



سلطانہ آصف فیضی

ذاکر صاحب

رشید احمد صدیقی

کتابی دنیا لمیٹڈ

بار اول — دہلی — قیمت ایک روپیہ

انتساب

"ہر اس شخص کے نام جو ذاکر صاحب
کو فخر و محبت کی نظر سے دیکھتا ہے!"

رشید احمد صدیقی

مضمون نگار سے ذاکر صاحب کا متفق الرائے ہونا ضروری نہیں ہے

(مضمون نگار)

ذاکر صاحب کی آنکھ میں شدید تکلیف تھی۔ علاج کے لئے بمبئی جا رہے تھے دہلی کے اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے کے لئے میں بھی موجود تھا، گاڑی روانہ ہوئی تو دل بھر آیا۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوئے۔ انسانی فطرت کو آڑے وقت تنکے تک کا سہارا ڈھونڈھ لینے کا عجیب ملکہ ہے۔ مجھے بھی آس پاس ہی سہارے مل گئے میں نے خیال کیا بھوک لگی ہے، جوتا نیا بھی ہے تنگ بھی۔ دن بھر دلی کی خاک چھانتا پھرا ہوں۔ کسی نے خلاصۂ موجودات سمجھنا تو درکنار " ہر مال چھ پیسے" سے بھی مخاطب نہ کیا، ممکن ہے یہی باتیں دل پر اثر انداز ہوئی ہوں۔ ساتھ ہی یہ خدشہ بھی پیدا ہوا کہ کہیں یہی تحت شعور میں پہنچ کر گل نہ کھلائیں۔ پاس کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ پہلو میں ایک گنوار نگروٹ اپنے پاؤں ہاتھوں کے حلقہ میں لئے ہوئے اس طرح بیزار بیٹھا ہوا تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ نہ لڑائی ختم ہوتی ہے نہ زمینداری۔ "ولندیزی" قسم کے جوتے منہ کھولے ہوئے سامنے پڑے تھے۔ میں نے گنوار کی نظر بچا کر اس کے جوتوں پر توجہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ جوتے کو گنوار کے پاؤں سے جو صدمے پہنچے تھے وہ آسام اور برما کے روڑے

کانٹوں اور حشرات الارض سے نہ پہنچے تھے۔ ان کی ہمدردی میں میں نے بھی اپنے پاؤں سے جوتے موزے علیحدہ کئے تو معلوم ہوا کہ ناخن گوشت سے جدا ہوگیا ہے لیکن "انگشت حنائی" کا دور دور تک پتہ نہیں۔ فیتے جوتے سے علیٰحدہ کرکے جیب میں رکھے، جوتے پھر سے پہنے اور علی گڑھ جانی والی گاڑی کی فکر میں روانہ ہوا، گاڑی تیار تھی۔ دو کیلے خریدے، چند دھکے کھائے۔ پلیٹ فارم پر داخل ہونے اور گاڑی پر سفر کرنے کے علیٰحدہ علیٰحدہ دو ٹکٹ تو پہلے سے تھے ہی ان کے علاوہ لڑائی کے اعزاز میں گاڑی میں داخل ہونے کے لئے کچھ لات گھے اور بہت سارے منتر از قسم گالی گلوج مقرر کردئے گئے تھے۔ جن کے بغیر نہ آپ ڈبے میں داخل ہو سکتے تھے نہ اپنی نشست محفوظ رکھ سکتے تھے گاڑی میں بیٹھ کر اونگھنے لگا اور ایسا معلوم ہوا جیسے محوری طاقتیں قیدیوں کو موت کے ڈبے میں نہیں بلکہ نزع کے ڈبہ میں لئے جارہی ہیں علی گڑھ کے اسٹیشن پر گاڑی دھچکے سے رُکی، سامنے یونیورسٹی پر اکرم کے نمائندے کھڑے تھے۔ فرمایا آج تانگے نہیں مل رہے ہیں۔ میں ان سے بغل گیر ہوگیا اور روندے جانے اور رو پڑنے سے بچ گیا۔

دوسرے دن ایک عزیز دوست کو ذاکر صاحب کی دلّی سے روانگی اور اپنے متاثر ہونے کا حال لکھا اور ضمناً یہ بھی لکھ گیا کہ یہ تو ذاکر صاحب کا بمبئی کا سفر تھا جب دل کا یہ حال ہوا۔ خدانخواستہ آخری مفارقت پیش آئی اور میں موجود ہوا

تو کیا عالم ہوگا۔ دوست نے اس خط کا جواب خلافِ معمول جلد دیا اور لکھا۔

"رشید صاحب۔ آپ بالکل نہ گھبرائیں ایک امید یہ بھی تو ہے، جس پہ کہا جاتا ہے دنیا قائم ہے، کہ آپ ذاکر صاحب سے پہلے رحلت فرمائیں اور اس طور پر آپ کو وہ دن دیکھنا نصیب ہو جس کا آپ کو اندیشہ ہے"

میں دوست کی اس برجستہ گوئی پر جھوم گیا۔ لیکن دل میں ٹھان لی کہ آئندہ تاحیات فریقین ان دوست سے اس قسم کے ازغیبی مسائل پر بالکل گفتگو نہ کی جائے گی!

گذشتہ اکتوبر میں حکومت ہند کی طرف سے کچھ ماہرین تعلیم ایک تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جانے والے تھے۔ ان میں ذاکر صاحب بھی تھے۔ روانگی سے کچھ پہلے علی گڑھ تشریف لائے۔ ایک دن کھاپی کر، پاؤں پھیلا کر، نیم غنودگی کی حالت میں قوم کے بخت بیدار پر گفتگو شروع ہونے والی تھی کہ مونگ پھلی والے نے آواز دی، مرشد نے خواب آلود لہجہ میں جواب دیا۔

"مزا سردی کا"!

میں نے کہا "یہ کیا؟ فرمایا مونگ پھلی ہندوستان کا بادام ہے"

میں نے کہا "پھر؟"

فرمایا "پھر کیا میں نے تو "جنرل نالج" (معلومات عامہ) کی بنا پر ایک بات

بتادی"! مونگ پھلی والا بلایا گیا تو بڈھا خوانچہ والا ہم دونوں کا قدیم مہربان نکلا ۱۹۲۰ء میں میں اور ذاکر صاحب صاحب باغ (ایم۔ اے۔ او کالج) میں رہتے تھے اور یہ کیلے، سیب، سنترے بیچنے لایا کرتا تھا۔ ذاکر صاحب شکوہ کرتے تو کہتا میاں گلے ہوئے نہیں ہیں مربے کے سیب ہیں۔ صرف آپ کے لئے بچا لیا کرتا ہوں۔

مرشد نے کہا۔ "کیوں بھئی وہ مُربّے والے سیب بھی بیچتے ہو یا نہیں"۔

بڈھا ہنس پڑا، پھر ایک آہ سرد کھینچ کر بولا "میاں کیا پوچھتے ہو کالج بدل گیا۔ اب ویسے لڑکے نہ آئیں گے"۔

ذاکر صاحب نے پوچھا "کیا بات ہوئی"؟

بڈھے نے کہا "میاں نفع نقصان کا تو ذکر کیا یہ تو روزگار کے ساتھ لگا ہی رہتا ہے لیکن اب لڑکوں میں وہ بات نہیں رہی"۔

میں نے پوچھا "آخر وہ کونسی بات تھی"؟ بڈھا بڑا گھٹا ہوا تھا، کھلا نہیں، ٹال کر بولا "بس میاں وہ بات نہیں رہی"! میں نے اور چھیڑا تو جھنجھلا گیا۔ بولا "پہلے کسی کی مجال تھی کہ کالج میں مونگ پھلی بیچنے لاتا"!

میں اور ذاکر صاحب دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے!

بڈھا سمجھا ہم دونوں دام کی طرف سے فکرمند ہیں۔ بولا "میاں دام کی فکر مت کیجئے، میں نے ذاکر صاحب سے بڑے پیسے کمائے ہیں۔ اب ان سے دام نہ لوں گا۔ اللہ ان کو خوش رکھے" اور چلا گیا!

اسی زمانہ قیام میں مکان کے بیرونی احاطے میں ہم دونوں ٹہل رہے تھے
ایک طرف آلوؤں کی کیاری تھی، سامنے بھینس بندھی ہوئی تھی، میں آلو کے مزے
پر اور ذاکر صاحب بھینس کے اطوار پر گفتگو کر رہے تھے

میں نے کہا "ذاکر صاحب آپ لندن جا رہے ہیں ایک چیز میرے لئے لیتے آئیگا"

بولے "وہ تو ضرور لاؤں گا"۔

میں نے کہا "کیا؟"

فرمایا "گلاب"

میں پھڑک گیا اور بولا "مرشد آپ کی انہی باتوں سے تو میں اب تک .....
کا ممبر نہیں بن سکا ہوں"

فرمایا "اس میں کیا شک ہے۔ میں گلاب لایا اور آپ نے انڈین نیشنل آرمی
میں بھرتی ہونے کی عرضی دی"۔

میں نے کہا "مرشد دیکھئے انڈین نیشنل آرمی کا مقدمہ زیر سماعت ہے
دشمنوں کے کان بھرے معلوم نہیں کیا فتاد پڑے پھر آپ ہی بھاگے بھاگے پھریں گے

مرشد نے کہا "یہ کیوں؟"

میں نے کہا "بات یہ ہے کہ میں پکڑ جاؤنگا تو آپ اسے قومی حادثہ سے تعبیر
کریں گے، میری تصویر چھپے گی، آپ کا پیغام شائع ہوگا

بولے "یہ کچھ نہ ہوگا"

میں نے کہا "ہوگا کیوں نہیں یہ بھی تو ممکن ہے کہ تصویر کے نیچے آپ کا نام ہو اور پیغام کے نیچے میرا —— دیکھئے میرے گلاب نہ بھولئے گا"

ذاکر صاحب لندن سے واپس آئے اور گلاب بھی لائے جس نے سنا اس نے تعجب کیا لیکن طے کوئی نہ کرسکا کہ اس میں کمال کس کا تھا فرمائش کرنیوالا یا فرمائش لانیوالا۔ ذاکر صاحب سے ان کے سارے دوستوں نے بڑی تاکید کردی تھی کہ وہ لندن کے مشہور ماہرین فن سے اپنی صحت کے بارے میں ضرور مشورہ کرتے آئیں جس کی ان کو بڑی ضرورت تھی۔ مجھے خاص طور پر اس کی خوشی تھی کہ اس کام کے سلسلہ میں ذاکر صاحب کو اپنی صحت درست کرنے کا موقع مل جائیگا اور چند ہفتے کیلئے انکو یہاں کے بے پایاں مناقشوں اور مصروفیتوں سے نجات مل جائیگی لیکن ہوا یہ کہ وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہ کرسکے صرف گلاب لائے، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جس کمیٹی میں ذاکر صاحب ہوتے ہیں اُس کے سارے ممبروں سے زیادہ کام وہ خود کرتے ہیں اور بیشتر اراکین یا تو سفر خرچ وصول کرتے ہیں یا انٹرویو دیتے ہیں یا اسٹیشنری پر سابق ممبر فلاں کمیٹی چھپواتے ہیں۔ لندن سے واپسی کے بعد سے اب تک میں ذاکر صاحب سے مل نہ سکا لیکن مجھے اندازہ ہے کہ وہ کمیٹی کانفرنس، دید و باز دید کے کاموں میں کیسے پھنسے رہے ہوں گے اور گلابوں کے حاصل کرنے اور لانے کی داستان کیا ہے، ان کے لانے میں کتنے اور کیسے کیسے سہل یا دلچسپ مراحل پیش آئے ہوں گے اور ذاکر صاحب نے اپنی ذکاوت

معصومیت اور مستقل مزاجی سے کس کس کو کس طرح زیر یا رام کیا ہوگا۔

یہی فرمائش میں نے کسی اور سے کی ہوتی تو وہ مجھے خوش کرنے یا اپنے ذوق کی میرے ذوق پر فضیلت جتانے کے لئے مجھ سے مزاح فرماتے یا ایک لمحہ کے لئے چہرہ ایسا بنا لیتے جیسے اس پر "خدا ملک معظم کو سلامت رکھے" کا ترانہ بج رہا ہے یا پھر فرماتے "دیکھئے اللہ تعالیٰ ہندوستان کی آبرو رکھ لے۔ اس مہم پر جانا پل صراط پر چلنے سے کم نہیں۔ اس کے بعد وعدہ کر لیتے کہ فرمائش ضرور پوری کریں گے لیکن واپس آنے پر ملاقات ہوتی تو جھپٹ کر بغل گیر ہو جاتے گردن یا آس پاس کا بوسہ لے کر رونی صورت بنا کر فرماتے، رشید صاحب کیا بتاؤں لندن پہنچتے ہی بیمار ہو گیا، ہارلی اسٹریٹ کا فلاں مشہور ماہر امراض روح قبض کرنے کے لئے بلایا گیا۔ فلاں ارل اور ڈیوک اور انجمن دشت قبچاق کے سکریٹری تجہیز و تکفین کے لئے آ گئے تھے یا کاموں میں ایسا پھنسا کہ مرنے کی مہلت نہ ملی، آج اس وزیر کا مہمان، کل اس خواجہ سرا کا میزبان، فلاں نامہ نگار کو انٹرویو دیا، فلاں اڈیٹر کے ٹیلیفون آئے، لندن کی تمام لڑکیاں طرح طرح کے پھول میرے سینہ پر نصب کرنے کے لئے میرے کمرہ کی کھڑکی کے نیچے قطار باندھے تمام رات "دست افشاں دپائے کوباں" ادھر میں ہندوستان کے غم میں ترسان و لرزاں، یہ احباب کی دعاؤں کا اثر تھا کہ کامیاب و کامران واپس ہوا۔ گلاب کے لئے میں نے وزیر ہند کو ٹیلیفون کیا، انھوں نے واشنگٹن کو واشنگٹن

نے ماسکو کو رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ جب تک کامریڈ اسٹالن تعطیل سے فارغ ہو کر ماسکو واپس نہ آجائیں اٹم بمب اور گلاب کے مسئلہ پر گفتگو معرض التوا میں رہے گی۔ پھر بڑے چاؤ سے فرماتے۔ رشید صاحب آخر آپ کو لندن سے گلاب منگانے کا کیا خبط سمایا۔ میرے باغ میں صدہا گلاب ہیں جنکا میری بیوی بہترین گلقند تیار کرتی ہیں آپ کو جتنے درختوں کی ضرورت ہو منگا لیجئے۔ اب اُن سے کون کہے کہ مجھے نہ گلقند کے گلاب چاہئیں اور نہ گلقند بیوی!

گلاب لانے کا واقعہ ذاکر صاحب کی سیرت و شخصیت کو پورے طور پر منقح و منور کرتا ہے۔ گلاب پانے کی جو خوشی مجھے ہوئی اس کا اظہار کچھ ایسا ضروری نہیں۔ البتہ ذاکر صاحب کا ان گلابوں کو لانا بجائے خود ایک مطالعہ ہے، دلکش بھی اور اہم بھی۔ اس کی دلکشی اور اہمیت صرف ایسے لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہے جو زندگی کے نعائم و فضائل کے قائل ہیں نہ کہ اس کے ذمائم و رذایل کے۔ میں دوست کے فضائل پر مرتا ہوں نہ کہ اس کے اقتدار و اختیار پر۔ اس لئے کہ اثر و اقتدار حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں جن کو سخت مذموم طریقوں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، یا جن کے حصول میں محض اتفاق کو دخل ہو سکتا ہے۔ لیکن فضائل نفس وہ نعمت ہے جو صرف خدا کے برگزیدہ بندوں کو ملتی ہے۔ ذاکر صاحب نے کبھی اثر و اقتدار کے حصول کی کوشش نہ کی۔ اثر و اقتدار البتہ

برابر اس کی کوشش کرتے رہے (مجھے ایک ایک کا علم ہے) کہ ذاکر صاحب ان کو قبول کرلیں لیکن انھوں نے کبھی ان کی طرف توجہ نہ کی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس میں ذاکر صاحب کو اپنے نفس کو زیر کرنے میں کوئی زحمت اٹھانی نہ پڑی ہوگی۔ جس طرح ریڈیو سٹ میں صرف مقررہ مخصوص لہریں بار پاتی ہیں اور دوسری تمام لہریں اس سٹ کے لئے بے کار ثابت ہوتی ہیں ٹھیک اسی طرح اچھے اور برگزیدہ انسان کے دل کے تاروں کو وہی خیالات وجذبات مرتعش کرسکتے ہیں جو خود اچھے اور برگزیدہ ہوں۔ یہی مثال ان لوگوں پر صادق آتی ہے جن کی فطرت میں ازل سے ٹیڑھ چلی آتی ہے۔ وہ صرف اس وقت اپنے زندہ ہونے کو محسوس کرتے ہیں جب ان پر شیطانی پرتو پڑ رہا ہو۔ میں ایسے لوگوں سے واقف ہوں جو انسانیت وانصاف سے متاثر ہوکر بھی کوئی کام کریں گے تو اس میں کہیں نہ کہیں کوئی کھوٹ یا نجاست ضرور ملادیں گے۔ یہاں میں قطعاً مبالغہ سے کام نہیں لے رہا ہوں۔

عرصہ ہوا ایک بار رنگون جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک دوکان پر کھجور خریدنے گیا۔ کھجوریں ناقص تھیں، دوکاندار نے کہا کہ ٹھہرئے اندر سے لاتا ہوں۔ وہاں سے نہایت عمدہ کھجوریں لا کر دیں۔ میں نے تعجب میں آکر پوچھا کہ بہتر مال فروخت کرنے کے لئے کھلی دوکان میں کیوں نہیں رکھتے، اس نے جواب دیا کہ یہاں کے بیشتر خریدار تازہ عمدہ کھجوریں نہیں خریدتے۔ یہ اس وقت خریدتے ہیں جب ان میں کیڑے پڑنے لگتے ہیں!! اس سلسلہ میں ضمناً ایک اور لطیفہ سن لیجئے۔

کلکتہ کی ایک دوکان پر ایک چیز کے دام پوچھے۔ دوکان دار نے جو قیمت بتائی وہ ٹھیک ہو یا نہ ہو، میرے بوتے کی نہ تھی۔ میں نے مزید گفتگو کی تو اس نے ہنس کر کہا "تو پھر آپ اس کے منتظر ہیں کہ اسے اس وقت خریدیں جب اس کے دام بڑھ جائیں"۔ اس سوال سے میں خفیف تو ہوا لیکن یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس وقت میں خریدار کی حیثیت سے نہیں، چور کی حیثیت سے حاضر ہوں!"

ذاکر صاحب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ کوئی بڑا آدمی ان سے یہ فرمائش کرتا کہ موقع اچھا ہے میرے لئے لندن میں کوئی اراضی خرید لینا یا ملک معظم کی خدمت میں میرا یہ خط پہنچا دینا تو ذاکر صاحب اس خط کو گم نہ کر سکتے تو لا کر واپس ضرور کر دیتے اور لندن میں اس فلاکت اور تباہی کے زمانہ میں کسی کا گھر خریدنے کے بجائے ایک آدھ دن اس کے گھر کی مرمت کے سلسلہ میں مزدوروں کے ساتھ کام کرتے۔ لیکن اگر ان کا کوئی معمولی دوست یہ فرمائش کر دیتا کہ میرے لئے ایک مرغی لیتے آئے گا تو وہ یقیناً مرغی بغل میں دابے ہوئے قصر بکنگھم سے گذرتے اکابر پارلیمنٹ اور "لولیانِ شوخ و شنگ" سے بے جھجک ہنستے بولتے "خدا حافظ" کہتے ہوئے ریل یا ہوائی جہاز کے اسٹیشن پر پہنچ جاتے!

ذاکر صاحب ان لوگوں میں ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ بڑائی اٹم بمب کی اجارہ داری میں اتنی نہیں ہے جتنی مرغی سے شرمندہ نہ ہونے میں ہے۔

گلاب کا لانا بظاہر ایک معمولی سی بات ہے لیکن اس کی تہہ میں ذاکر صاحب کی بے بہا سیرت کا موتی تارے کی طرح دمکتا نظر آتا ہے ایک دوست کی معمولی سی فرمائش پوری کر دینے کے لئے بڑی سے بڑی دشواریاں اٹھانے کا ایک مخصوص سرور ہوتا ہے جس سے آشنا ہونا ہر ایک کا مقدر نہیں۔ مجھے گلاب پانے کی بڑی خوشی ہوئی گر یہ فرمائش کسی اور نے پوری کی ہوتی تو بھی خوشی ہوتی لیکن ذاکر صاحب کا بیچ میں ہونا میری خوشی کا خاص طور پر موجب ہوا، اس کے وجوہ ہیں، اول تو یہ کہ میں زندگی کی اچھی اور بڑی قدروں کی تعبیر افسانے کے کرداروں سے نہیں اپنے احباب بالخصوص ذاکر صاحب کے اطوار سے کرتا ہوں اور جب اور جہاں کہیں اس کی تصدیق ہوتی ہے تو میں اپنے آپ کو داد دیتا ہوں کہ میں بڑی بات اور بڑے آدمی کو پہچانتا ہوں اور اس کی قدر کرتا ہوں۔ اس لئے مجھے طفیلیوں، چوروں یا غاصبوں کی طرح نہیں بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے سوسائٹی میں جگہ پانے کا حق حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ میں اس پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا واقعہ ایسا نہیں ہوا جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہر شخص کے لئے رونما نہ ہوتا ہو یعنی ہر شخص ہر لمحہ تاریخی ہیروؤں کی آزمائش سے گزرتا رہتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے میرے دل میں یہ بات بیٹھ سی گئی ہے کہ اگر خدا ویسا ہی ہے جیسا کہ میں نے سمجھا ہے تو حشر کے دن ہم میں سے بہتوں کو یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوگی کہ ہم نے کس کو کہاں پایا اور بڑی سے بڑی منزلت والوں کی صف میں جن کے کارناموں سے دنیا کا چپہ چپہ گونج

رہا ہے، ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن سے شاید ان کے محلہ والے بھی پورے طور پر واقف نہ تھے۔

ایک موقع پر مجھے ذاکر صاحب کے اعزاز میں تقریر کرنی پڑی۔ میں نے تھوڑی دیر تک یہ سوچا کہ اس پچیس تیس سال میں ذاکر صاحب کی کونسی بات مجھے سب سے زیادہ ممتاز نظر آئی، فی الفور میرے ذہن میں یہ آیا کہ ذاکر صاحب نے طالبعلمی کے زمانہ سے لے کر آج تک کوئی کام ایسا نہیں کیا جو دوسرے درجہ کا ہو۔ تیسرے درجہ کا تو سوال ہی نہیں!

ذاکر صاحب علی گڑھ کے طالبعلم تھے، نان کوآپریشن میں وہاں سے علیحدہ ہوئے اور جرمنی چلے گئے، وہاں سے آکر جامعہ کا کام سنبھالا۔ جامعہ کو ذاکر صاحب نے کس حال میں پایا، کیسے نازک مواقع پر اس کو سنبھالا اور کس کس طرح اس کو سنوارا، اس زمانہ میں ان پر اور ان کے ساتھیوں پر کیا گذری، اس کی داستان بڑی طویل ہے۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ کئی سال ہوئے دولت آصفیہ سے جامعہ کو گرانقدر مالی امداد ملی۔ ذاکر صاحب سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی۔ میں نے مبارکباد دی تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے "رشید صاحب آج گیارہ سال بعد جامعہ کے اسٹاف کو پوری تنخواہ دی جاسکی ہے" میں متحیر رہ گیا، میں نے کہا "ذاکر صاحب یہ واقعہ جامعہ کی تاریخ میں نہیں ہماری

تمام قومی تحریکوں میں یاد رکھا جائیگا۔ جہاں ایسے کام کرنے والے ہوں وہاں میرا گذر تو ہو نہیں سکتا لیکن کسی دن ریڈیو پر تقریر کرنے دہلی آیا تو دو رکعت نفل پڑھنے جامعہ نگر ضرور آؤں گا!"

نان کو آپریشن کی زد میں علی گڑھ ہی کا ایک حصہ ٹوٹ کر جامعہ بنا۔ "چشم زلیخا" کو "نور دیدہ یعقوب" ہی روشن کئے ہوئے ہے۔ اس زمانہ کے بیشتر بہترین طالبعلم بھی علی گڑھ سے نکل کر جامعہ میں شامل ہو گئے۔ لیکن جامعہ کو موجودہ شکل، حیثیت اور شہرت دینے کا سہرا تمام تر ذاکر صاحب اور ان کے بے لوث رفقا کے سر ہے، علی گڑھ کے بعض لوگوں کی نظر میں جامعہ کا قیام ایک حریف ادارہ کی حیثیت سے کچھ دنوں کھٹکا۔ یہ بدگمانی رفتہ رفتہ دور ہو گئی لیکن جیسا کہ ہمارے ذہن و اخلاق کا مذموم خاصہ ہے۔ ہم ہر تحریک کو اکثر اپنے ذاتی محدود و مشتبہ اغراض و مقاصد کی روشنی میں دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ذاکر صاحب اور ان کے رفقا کی طرف سے علی گڑھ کا ایک مخصوص طبقہ بدگمان رہا اور اب بھی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اس بدگمانی کے باوجود جو عناد کی حد تک پہنچی، ذاکر صاحب علی گڑھ کے ہر انتظام میں شروع سے آخر تک شریک رہے محض ضابطہ کی رو سے نہیں بلکہ انھوں نے انتہائی خلوص، تندہی، قابلیت اور ہمدردی کے ساتھ یونیورسٹی کے نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ معاملہ میں حصہ لیا۔ اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ انھوں نے نادانستہ طور پر بھی کبھی کوئی

ایسا کام نہ کیا جو علی گڑھ کے حقیقی مقاصد کے ذرہ برابر بھی منافی ہوتا ان کا بدترین دشمن بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ذاکر صاحب نے علی گڑھ کی انتظامی در و بست سے گہرا اور اہم تعلق رکھتے ہوئے بھی کسی معاملہ میں اپنے خیال، الفاظ یا عمل سے کوئی بات ایسی کی ہو جس سے علی گڑھ کے نام پر حرف آتا ہو یہی نہیں بلکہ جماعت منتظمہ میں جب تک وہ شریک رہے دوست اور دشمن دونوں کو اطمینان رہا کہ کوئی ایسی بات نہ ہوگی جو انصاف یا ہمدردی سے بعید ہو! لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ جس معاملہ میں ذاکر صاحب کو قومی پیمانہ پر سب سے زیادہ رسوا کیا گیا اسی معاملہ میں رسوا کرنے والے ذاتی اور خفیہ طور پر ذاکر صاحب کی رہنمائی اور ہمدردی کے ملتجی دیکھے اور پائے گئے!

جرمنی سے واپس آنے کے بعد سے آج سے چند سال پیشتر تک ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کورٹ، اکزیکٹو کونسل، اکیڈمک کونسل اور شعبہ اقتصادیات کے ممبر رہے۔ ان تمام اداروں میں جب کبھی کوئی کمیٹی کسی مسئلہ سے متعلق بنائی گئی ذاکر صاحب کا نام ممبری کے لئے سب سے پہلے پیش کیا جاتا اور بے چون و چرا بڑی خوشدلی اور اعتماد کے ساتھ قبول کر لیا جاتا، سالہا سال وہ مسلم یونیورسٹی کے انتظامی معاملات میں شریک کار رہے۔ بیرونی اشخاص کے ممبر ہونے کی جہاں کہیں ضرورت ہوئی ذاکر صاحب ضرور شریک کئے گئے۔ اور ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہے جس نے ذاکر صاحب کی معاملہ فہمی، خلوص اور قطعاً بے لوث ہونے کا اعتراف نہ کیا ہو!

تمام واقعات دہرانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ صرف دو ایک کا تذکرہ کر دینا کافی ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں ایک تحریک یہ پیش ہوئی کہ جماعت اساتذہ میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کے عقائد مذہبی قابل گرفت ہیں۔ اس تحریک میں جو پیچیدگی اور نزاکت تھی اس کا اثر اسٹاف کے طبائع پر بالعموم جو کچھ پڑ سکتا تھا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اکزکٹو کونسل میں یہ مسئلہ پیش ہوا۔ سر سلیمان مرحوم وائس چانسلر تھے۔ کونسل میں جو تقریریں ہوئیں، ان میں جوش، قابلیت، قانون دانی، بیزاری، مایوسی غرضکہ ہر طرح کے جذبات کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ مسئلہ کی نوعیت یہ تھی کہ ہر مسلمان ممبر اسٹاف سے ایک تحریر لی جائے کہ وہ مذہبی عقائد اور اسلامی روایات کا احترام کرے گا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس تحریر کا مضمون کیا ہو؟ جب بحث نے طوالت اختیار کی تو سر سلیمان مرحوم نے ذاکر صاحب سے فرمایا "ڈاکٹر صاحب آپ نے تو ساری بحث سن لی اب کوئی فارمولا ایسا وضع کیجئے جس پر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اتفاق ہو جائے"۔ ذاکر صاحب نے فی الفور ایک مختصر سا مسودہ تیار کر کے مرحوم کی خدمت میں پیش کر کے حاضرین کو سنا دیا۔ بغیر کسی مزید گفتگو کے ہر شخص نے اسے قبول کر لیا، اس میں وہ لوگ بھی تھے جو اس تحریک کی موافقت میں سر بکف تھے۔ اور وہ بھی تھے جو اس کی مخالفت میں شمشیر برہنہ۔ یہ مسئلہ اس تحریر سے ایسا ہموار ہوا کہ پھر کبھی اس کی کوئی شق معرض بحث میں نہ آئی۔

اسٹاف اور جماعت منتظمہ میں سر سلیمان مرحوم ہی کے زمانہ میں ایک مسئلہ یہ پیش

ہوا کہ یونیورسٹی کی تعطیلیں متعین کرنیکا اختیار اکیڈمک کونسل کو تھا کہ اکزکیٹو کو، اس بحث نے بھی ناخوشگوار فضا پیدا کی، اور فریقین میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو دونوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے پر آمادہ ہوتا یا اس کی آمادگی نتیجہ خیز ثابت ہوتی۔ سر سلیمان مرحوم نے ذاکر صاحب سے فرمائش کی کہ وہ اسٹاف سے گفتگو کرکے مفاہمت کی کوئی صورت نکالیں۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے اراکین اسٹاف سے گفتگو کرکے اس گتھی کو سلجھایا۔ ایک صاحب جو ذاکر صاحب اور جامعہ دونوں کو ہمیشہ شبہ اور حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اور قومی تحریکوں اور قومی سرداروں کو اسی نظر سے دیکھتے تھے جس نظر سے یہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ میں دیکھے جاتے تھے ذاکر صاحب کی گفتگوئے مصالحت سن کر ذاکر صاحب کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے "میں نہیں سمجھتا تھا کہ ذاکر صاحب کا دماغ اتنا سلجھا ہوا ہے اور ذہن اس درجہ رسا۔

بنیادی تعلیمی اسکیم کی رپورٹ ذاکر صاحب نے علی گڑھ میں میرے ہی مکان پر ایک کمرہ میں بیٹھ کر شاید ایک ہفتہ کے اندر مرتب کر ڈالی کمرہ بھی جو بیک وقت سونے، بیٹھنے، کھانے پینے، لکھنے پڑھنے اور ڈنڈ مچانے کا کام دیتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، کچھ دیر تک تعلیمی مسائل پر بحث رہی۔ اسی سلسلہ میں کچھ دوست ملنے آ گئے تو ان سے خوش گپی ہونے لگی، کتابوں، رپورٹوں، فائل وغیرہ کا انبار ہے۔ کاغذات پھیلے ہوئے ہیں۔ ٹریننگ کالج کے لوگ آ گئے تو ان سے تعلیمی مسائل پر بحث چھڑ گئی کوئی خوانچہ والا آ گیا تو جو کچھ اس کے پاس

رہا اسی سے شغل شروع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر آگئے تو امراض و علاج کے لطائف چھڑ گئے شعر و شاعری کا شائق آگیا تو شعر خوانی کی مجلس گرم ہو گئی۔ کوئی اچھا طالب علم آنکلا تو اس کے مضموں پر باتیں ہونے لگیں۔ غرض جو آیا اسی کے مذاق کے مطابق گپ ہونے لگی۔ اس تمام بحث مباحثے میں ذاکر صاحب اس خلوص و خوبی سے حصہ لیتے جیسے تمام عمر اسی شغل میں زندگی بسر ہوئی ہے۔ جو آتا بہت کچھ سیکھ جاتا اور ایسا خوش ہوتا جیسے اس نے اس دن کوئی بڑا کام کیا تھا۔ ذرا مہلت ملتی تو پھر رپورٹ کی ترتیب شروع ہو جاتی۔ وہ ہر شخص کے سامنے اپنے خیالات اور نتائج پیش کرتے اس کا مشورہ طلب کرتے، اپنی سمجھاتے، اس کی سنتے اور پھر آخری رائے قائم کرتے۔

ایک دن میں نے تنگ آکر کہا "مرشد" یہ کہاں کا کھڑاگ پھیلایا، جب دیکھیے بچوں کی عمر، بچوں کے مشاغل، تکلی ڈنڈے اور سوت کپاس کی بحث چھڑی ہے تمام دن خدائی خواروں یا حق بخشوائے ہوئے لوگوں کا مجمع رہتا ہے"۔ فرمایا، "سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ آج اتفاق سے پنسل بنانے کے لئے کسی کے پاس چاقو نہ ملا ورنہ بقیہ مراحل بھی طے ہو جاتے، اب کل کوئی سبیل ایسی نکالئے کہ مجھے چند گھنٹے یکسوئی کے مل جائیں سارا خاکہ ذہن میں ہے رپورٹ مکمل ہو جائیگی"

دوسرے دن میں نے اپنے پرانے مکان کے بالا خانہ پر ذاکر صاحب کو مقفل کر دیا، مقفل اس لئے نہیں کہ کوئی ملاقاتی بار نہ پائے بلکہ اس کا

خطرہ تھا کہ خود مرشد نہ نکل جائیں۔ ہوا وہی جس کا خطرہ تھا۔ صبح بالا خانہ پر مقفل ہوئے۔ دو گھنٹے گذرے ہوں گے۔ ایک صاحب ملنے آئے۔

نوکر نے کہا۔

"ذاکر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں"

اُنھوں نے نقد و جرح شروع کی۔

مرشد کے کان تک آواز پہنچی، روشندان کچھ اونچا نہ تھا۔ اسٹول رکھ کر عرفہ سے بولے "ارے میں یہاں مقفل ہوں۔ کنجی رشید صاحب کے پاس ہے لیکن کوئی مضائقہ نہیں، آپ اس بات کا پتہ لگائیے"۔

انھوں نے کہا "ہاں، رپورٹ نقل کرلایا ہوں"

فرمایا "سنائیے۔"

انھوں نے سنانا شروع کیا۔ میں یونیورسٹی سے آیا تو رومیو جولیٹ کا یہ ڈرامہ نظر آیا۔

میں نے کہا "مرشد یہ کیا ہے"؟

فرمایا "ذرا ٹھہرئے گا۔ بس ایک منٹ"

افسانہ ختم ہوگیا۔

میں نے بالاخانہ پر پہنچکر قفل کھولا تو مرشد سارا کام کئے ہوئے چاروں شانے چت کچھ گنگنا رہے تھے، مجھے دیکھا تو لیٹے ہی لیٹے ایک زقند بھری اور سرو قد

کھڑے ہو گئے، فرمایا "ذرا پانی پلوائیے۔ کام ختم ہو گیا"

میں نے کہا "یہ آپ کیا سن رہے تھے"

کہنے لگے "فلاں رپورٹ کا حوالہ دینا تھا، ایک جگہ شبہ ہوتا تھا، اس لئے ان صاحب سے کہا تھا کہ اصل رپورٹ دیکھ آئیں۔ انھوں نے جو سنایا تو اطمینان ہو گیا کہ جو یاد تھا وہ ٹھیک تھا۔"

میں نے کہا "اب تو جب تک آپ کا قیام ہے کوئی زق زق نہ ہو گی"؟

فرمایا "ہر گز نہیں" میں نے کہا "اللہ کا شکر ہے، آج ڈاکٹر اصغر کے ہاں چائے پی جائے تو کیسی رہے گی"؟ کہا "ضرور، ان سے بلی کا بچہ بھی لینا ہے"

میں نے کہا "بلی نے تو بچہ نہیں دیا ہے۔ کتے نے البتہ دیا ہے" کہنے لگے، "انھی کا سہی! سعیدہ (ذاکر صاحب کی بچی)، کے لئے کچھ نہ کچھ لے جانا ضروری ہے گھر پہنچنے پر دو ہی تو سوال کئے جاتے ہیں۔ بیوی کہتی ہیں کیا کھویا اور سعیدہ پوچھتی ہے کیا لائے۔"

ڈاکٹر اصغر کے ہاں پہنچے تو میاں بیوی دونوں باغ باغ ہو گئے۔ ان کی اہلیہ ایک جرمن خاتون ہیں۔ ان کو نفیس کیک، بسکٹ اور انگریزی مٹھائی بنانے اس سے زیادہ کھلانے اور مکان کو سجانے اور ستھرا رکھنے کا شوق اور مریض کی تیمارداری کرنے میں کمال حاصل ہے ذاکر صاحب کے پہنچتے ہی انھوں نے طرح طرح کی کھانے کی چیزیں لا رکھ دیں۔ ہم سب نے کھانا اور ذاکر صاحب نے پوچھنے اور

سیکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کیک اور بسکٹ کے بنانیکا کیا طریقہ ہے۔ اس کے لئے مخصوص چولھے اور تنور کیسے بنتے ہیں۔ مرغیاں پالنے کی کیا تدابیر ہیں اور یہ تمام باتیں محض لطفِ سخن یا عوائد سیمیہ کے طور پر نہیں بلکہ یہ سب اس لئے کہ جامعہ میں ان کو کس طرح نافذ کیا جائے۔ باورچی خانہ میں جا کر چولھے کا نقشہ دیکھا اور سمجھا، مرغی اور بط کے ڈربے دیکھے۔ ایک بط پر ذرا زیادہ توجہ ڈال دی وہ بیگم اصغر نے دوسرے دن ذاکر صاحب کے اعزاز میں میز پر چن دی۔

ایک دن ڈاکٹر اسلام الحق انصاری آ گئے۔ ان سے پیتھالوجی پر بحث ہونے لگی۔ اس زمانہ میں ذاکر صاحب کو جامعہ کے لئے ایک ڈاکٹر کی ضرورت تھی لیکن ڈھنگ کا کوئی آدمی نہ ملتا تھا۔ اس لئے طے یہ کیا کہ کچھ اور نہیں تو قارورہ وغیرہ جانچنے کا جو طریقہ ہے وہ خود ہی ڈاکٹر انصاری سے سیکھ لیں۔ چنانچہ دوسرے دن طبیہ کالج پہنچے۔ اور وہاں سے سیکھ سکھا کر واپس آ گئے۔ ذاکر صاحب نے انٹرمیڈیٹ سائنس میں کیا تھا اور میڈیکل کالج لکھنؤ میں قریب قریب داخل بھی ہو گئے تھے لیکن پھر چلے آئے اور بی اے میں فلسفہ اور اقتصادیات کے مضامین لے لئے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر انصاری سے جو کچھ سیکھ کر گئے تھے اس کا کاروبار کیسا چل رہا ہے، کہنے لگے "خوب چل رہا ہے، معمولی جانچ کا کام بالکل آسان ہے"!

میں نے کہا "مرشد تشخیص امراض اور معالجہ کے آپ نے بہت سے طریقے تو خود ایجاد کیے ہیں، کیا ہرج اگر آپ یونانی طب کا بھی مزاج دریافت فرمالیں"

فرمایا، "وہاں فن کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی عقل اور تجربہ کی۔"

میں نے کہا "کیا بات ہوئی"، کہنے لگے "آج کل مشین اور کتابوں نے ہر کام کو اتنا آسان بنا دیا ہے کہ عقل اور تجربہ کو کوئی کام میں نہیں لاتا صرف فیصلہ یا بشارت دے دیتا ہے"۔

اچھا ایک لطیفہ سنئے، جامعہ کے چھوٹے بچوں کے ایک بڑے میاں نگراں تھے۔ ایک بچے کی طبیعت خراب ہوئی، ڈاکٹر صاحب بلائے گئے، نگراں نے مرض کی تاریخ سنانی شروع کی۔ اتنے دن ہو گئے یہ استعمال کیا وہ استعمال کیا حتی کہ تھرمامیٹر بھی استعمال کیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ڈاکٹر چپ ہو گیا۔ اس نے معمولی دوا لکھ دی، پرہیز پوچھا گیا تو اس نے بتایا سوائے آپ سے پرہیز کرنے کے اور کسی پرہیز کی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے ذاکر صاحب کو چھیڑنے میں زیادہ لطف آتا ہے، میں نے کہا "مرشد (چشم بد دور) آپ سراپا سے بھی جالینوس معلوم ہوتے ہیں، ڈاکٹر کہلاتے ہی ہیں اگر اس وقت کوئی آجائے اور آپ کو نبض اور قارورہ دکھائے تو آپ کیا کریں گے"۔

کہنے لگے "نبض سے تو صرف مریض پر توجہ ڈالی جاتی ہے۔ قارورہ سے

ہاضمہ کا اور نبض سے عادات کا نقص بتانا چاہئے۔ معمولی لرزہ بخار کھانسی زکام پیچش میں تو عقل صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف دوا بتا دینا کافی ہے۔ سفید پوش پیشہ ور مریضوں کو باتوں پر دھر لیجئے۔ وہ دوائیں پہلے سے کھاتے ہوں گے۔ اور آپ چاہے جو بتائیں استعمال وہ اپنی ہی دوا کرینگے ہر شخص چاہے گا یہ کہ اسے وہی چیز کھونے کو پھر مل جائے جو وہ کھو چکا ہے نوجوانوں کے امراض متعین ہیں، لیکن ان کا اقرار وہ صفائی سے نہیں پھر دٹ سے کریں گے اور اپنے امراض کو تاثرات کے پردہ میں طرح طرح سے ملمع و مرصع کر کے بیان کریں گے۔ مثلاً وہ کسی طبیب کے ہاں جائیں گے تو شروع اس طور سے کریں گے کہ ان کے سر میں درد رہتا ہے، پھر حلق کی خرابی بتائیں گے، اس کے بعد نزلہ، زکام اور تداخل فصلیں پر اظہار خیال ہوگا۔ وہاں سے اتر کر معدہ کی بے وفائی کا تذکرہ کرتے کرتے آخری تان یا "خلاصہ فریاد" بقیہ اعضائے رئیسہ کی نارسائی پر توڑیں گے!

؎ ذاکر صاحب کی تقریر و تحریر دونوں میں ایک خاص چیز ملتی ہے جو کہیں اور کم دیکھی گئی ہے۔ ماہرین طبیعات کا مدتوں خیال رہا کہ روشنی کی رفتار بخط مستقیم ہوتی ہے۔ بعد کی تحقیقات یہ ہے کہ اس کی رفتار بخط مستقیم نہیں بلکہ جست و خیز کے ساتھ ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی تحریر و تقریر دونوں میں یہ بات ملتی

ہے۔ وہ مروجہ طریقوں سے کام نہیں لیتے بلکہ شروع سے آخر تک سامع یا قاری کی توجہ کو اپنے الفاظ اور خیالات کی تازگی و توانائی سے تب و تاب دیتے رہتے ہیں اور اس کے تصورات کو نہ تھکنے دیتے ہیں نہ دم لینے دیتے ہیں۔ کم لوگوں کی تحریر و تقریر حشو و زوائد یا بندھے ٹکے الفاظ و عبارت سے اتنی پاک ہوتی ہے جتنی کہ ذاکر صاحب کی۔ ان کی تقریر میں نہ خطابت ہوتی ہے نہ موعظت لیکن خطابت کا زور اور گرمی اور موعظت کی رحمت و شائستگی بدرجۂ اتم ملتی ہے۔ الفاظ و عبارت میں صفائی، خیالات میں رفعت اور جذبات میں سچائی ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب تقریر کرتے ہیں تو مجھے پہاڑ کی فضا یاد آجاتی ہے۔ پہاڑ ہی کا اوج، وزن و وقار، ان کی تقریر اس چشمہ کی مانند ہوتی ہے جو اپنی سیل سفر کی ہر منزل میں شفاف شادماں و شگرف کار رہتا ہے۔ لیکن جہاں کہیں ذاکر صاحب نے ملک پر چھائی ہوئی تاریک کہر اور ساتھیوں کے تذبذب یا تھکن کی طرف اشارہ کیا ہے، وہاں ان کا لہجہ دھیما اور حزیں ہوگیا ہے الفاظ میں مرہم ہے لیکن پیغام میں وہی گرمی اور جگر تابی ہے۔ جو ذاکر صاحب کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

ذاکر صاحب کی تقریر کا لطف اس وقت دوبالا ہوجاتا ہے جب حاضرین میں سے کوئی بڑا اور برخود غلط آدمی بے سمجھے بوجھے محض اپنی اہمیت جتانے کے لئے اعتراض کردے۔ طالب علمی کے زمانہ میں یونین میں ذاکر صاحب کی جوابی تقریر

سننے کے لئے ہم سب خاص طور پر جمع ہوا کرتے تھے ایک سال وائس پریسیڈنٹ کے لئے ذاکر صاحب بھی امیدوار تھے سارے طلبا خواص و عوام کے نام سے دو گروہ میں منقسم ہوگئے تھے۔ ذاکر صاحب عوام کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر فریق کے امیدوار کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی قابلیت واہمیت جتانے کے لئے یونین میں تقریر کرے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کو بھی بحث کے لئے عنوان دینا پڑا۔ مخالف جماعت نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ ذاکر صاحب کے لئے فلاں پروفیسر نے تقریر لکھدی اور وہ اس کے رٹنے میں مصروف ہیں، مباحثہ کا وقت آیا۔ یونین میں تل رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ ذاکر صاحب کا نام لیا گیا اور ہال تالیوں اور سیٹیوں سے اس طور پر گونجا جیسے "ہوئے فدا در و دیوار پر در دیوا!"

ذاکر صاحب داہنی طرف کے اسٹینڈ پر آئے اور بولے "میں نہایت ادب کے ساتھ لیکن ضابطہ سے اپنی موضوع بحث کو اس مجلس کی خدمت میں پیش کرتا ہوں مجھے اس بارہ میں جو کچھ عرض کرنا ہے وہ میں اپنی جوابی تقریر میں عرض کرونگا فی الحال اتنا ہی عرض کرنا ہے"۔ یہ کہہ کر اپنی جگہ پر لوٹ آئے، لیکن فوراً ہی ایک اُدھم مچ گیا، فریقِ مخالف نے خوب پھبتیاں کسیں۔ اور شور مچایا۔ یہ معلوم ہوا جیسے الکشن کے نتیجہ کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ذاکر صاحب کے حامیوں کا یہ حال کہ کوئی غصہ میں کوئی مایوس ہو کر کوئی اپنے آپ پر نفرین کرتا ہوا اور کوئی ذاکر صاحب کو آنکھوں آنکھوں میں تناول کرتا مجمع سے جانے لگا۔ کچھ اس طور پر

جم کے بیٹھ گئے کہ یا تو مار ڈالیں گے یا مر کے اٹھیں گے۔ مخالفین کی بن آئی تھی۔ اس دن صرف مخالفین نے تقریریں کیں اور جس کے دل جو آیا اس نے ذاکر صاحب اور اُن کے حمایتیوں کو سنا ڈالا۔

جواب کا وقت آیا تو ذاکر صاحب پھر اسٹینڈ پر آئے۔ اُن کے موافقین بھی جو یونین کے باہر آس پاس چہ میگوئیوں میں مصروف اور کچھ بپھرے ہوئے دروازہ سے لگے کھڑے تھے رفتہ رفتہ واپس آئے۔ ذاکر صاحب پر عالم کچھ ایسا طاری تھا کہ کسی نے تالی تک نہ بجائی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ موضوع بحث پر اب بھی میں کوئی تقریر نہ کروں گا۔ صرف مخالف تقریروں کا جواب دونگا۔ اس کے بعد انھوں نے ہر مخالف کے دلائل کے جواب دینے شروع کئے اور جہاں تہاں ان کے آداب محفل، انداز و لہجہ پر فقرے بھی چست کرتے گئے۔ مجمع سے صدائے تحسین بلند ہونی شروع ہوئی۔ تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑا شاعر اپنی بہترین نظم سنا رہا ہے جس کے ایک ایک شعر پر مجمع تلے اوپر ہو رہا ہے۔ تقریر ختم ہوئی، رائے لی گئی تو سارا ہال موافقت میں کھڑا ہو گیا۔ صدر نے نتیجہ کا اعلان کیا۔ اب ذاکر صاحب کے موافقین کی بن آئی تھی۔ انھوں نے مخالفین کا پیچھا گھر تک نہ چھوڑا پانی پت کی آخری لڑائی کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ جنوبی ہند میں کوئی مرہٹہ خاندان ایسا نہ تھا جس کے ہاں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ یہی حال ذاکر صاحب کی تقریر اور ان کے جنیجے

تلے برجستہ فقروں نے مخالفین کا کیا۔

مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ایک جلسہ میں سر سلیمان مرحوم صدر تھے۔ اراکین میں سے ایک صاحب اپنے آپ کو بڑا اطباع اور یگانہ روزگار سمجھتے تھے اور ہر لمحہ اپنی نشست سے بیٹھے بیٹھے لوگوں پر فقرے چست کیا کرتے تھے اور کوشش یہ کرتے تھے کہ ان کی موجودگی میں کسی کی پیش نہ جائے۔ ذاکر صاحب نے ایک مسئلہ پر تقریر کی جس کو ہر شخص نے غور و احترام کے ساتھ سنا۔ بڑے سے بڑے مخالف مجموں میں بھی ذاکر صاحب کی تقریر ہمیشہ خاموشی اور احترام سے سُنی گئی۔ یہ امتیاز میں نے کم لوگوں میں پایا۔ تقریر کے ختم ہوتے ہی، وہ صاحب تلملا اُٹھے اور فوراً اپنی نشست پر سے ایک پوائنٹ آف آرڈر سر کیا۔ جس میں تفاخر اور خود نمائی کی شان پورے طور پر جلوہ گر تھی۔ بولے "جناب والا نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ ذاکر صاحب نے ابھی جو تقریر کی ہے وہ بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی" کچھ اور ارشاد فرمانے والے ہی تھے کہ ذاکر صاحب نے اُٹھ کر فرمایا۔ "جناب والا میں نے اپنی تقریر میں کہیں اس کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میری تقریر محترم ممبر کی سمجھ میں آئے گی"۔ اس پر ایسا بے محابا قہقہہ پڑا کہ سر سلیمان مرحوم جیسے ثقہ آدمی جو ایسے مواقع پر اپنی طرف سے کبھی بے تکلف نہیں ہوتے تھے بے اختیار ہنس پڑے اور معترض صاحب کچھ ایسے سٹ پٹائے کہ دوران مجلس میں صرف سکوت

پر قانع رہے۔

کورٹ ہی کا ایک اور جلسہ بھی مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ اس میں جو مسئلہ زیر بحث تھا وہ اس درجہ اہم اور متنازعہ فیہ تھا کہ کورٹ کے با اقتدار اراکین ہر گوشہ ملک سے بڑی کثرت سے شریک ہوئے تھے اور جو کچھ فیصلہ ہونے والا تھا اس میں کہیں شک و شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ فضا ایسی دگرگوں تھی کہ بڑے سے بڑے شخص کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ مخالفت میں تقریر کرنا تو درکنار مخالفت میں چپکے سے ہاتھ اٹھانے کی بھی جرأت کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر طرف سنگین کھچی ہوئی ہیں جس نے قدم اٹھایا وہ جان سے گیا۔ معمولی ابتدائی کاروائی شروع ہو کر ختم ہوئی۔ تحریک پیش کرنے والوں میں ایسے اصحاب تھے جو قانونی قابلیت، قومی خدمات، ذاتی جاہ و حشمت ہر اعتبار سے قوم اور ملک میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ یہ مرحلہ بھی ختم ہوا اور وہ لمحہ آیا جب اس کی مخالفت میں کوئی کھڑا ہو، چند لمحے ایسا سناٹا رہا کہ ہر شخص اپنے قلب کی حرکت سن سکتا تھا۔ معرکہ میں پہلا قدم اٹھانے والا اور پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے والا ہی مرد کہلاتا ہے۔ ذاکر صاحب سب سے پیچھے کی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُٹھے اور محض ایک جملہ کہہ کر بیٹھ گئے۔ "یہ تحریک قانوناً پیش نہیں کی جا سکتی!" سارا مجمع مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ قانون میں جن صاحب کا پایہ ہائیکورٹ تک مسلم تھا اور جو اس تحریک کے قانونی پشتیبان تھے۔ کڑک

کر بولے "قانونی سقم کوئی نہیں ہے۔ میں چیلنج کرتا ہوں!" جلسہ میں جو لوگ بحث کرنے یا سمجھنے کے لئے نہیں۔ بلکہ ہاتھ اٹھانے یا ادھم مچانے کے لئے آتے ہیں یا بلائے جاتے ہیں ان کی بن آئی ہے۔ ذاکر صاحب نے ایک لفظ نہ کہا، بڑی مشکلوں کے بعد جب مجمع کو کسی قدر خاموش کیا گیا۔ اور فاضل معترض نے اپنا چیلنج دہرایا تو ذاکر صاحب نے ان کو ایک اور موقع کی یاد دلائی جب انھوں نے ایسے ہی ایک مسئلہ میں ذاکر صاحب کو چیلنج دیا تھا اور بعد میں اپنی غلطی تسلیم کی۔ اور فرمایا ایسے مواقع پر چیلنج نہیں دیتے سوچتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے اب ایک مختصر سی تقریر کی اور اپنے اعتراض کی بڑی سنجیدگی لیکن وثوق اور دبدبہ کے ساتھ وضاحت کی! جلسہ کے مدبروں نے غور کیا تو ذاکر صاحب کا اعتراض صحیح نکلا، معترض نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ ہال کے اندر بڑی دیر تک دوڑ دھوپ اور خفیہ سرگوشیاں ہوتی رہیں بالآخر ذاکر صاحب ہی کی مشورت سے مطالبہ کی نوعیت بدل گئی اور کاروائی شروع ہوئی۔

علمی وفنی مسائل پر تحقیقات کرنا اور ان سے طلبا کو آشنا کرانا یونیورسٹی کے معلمین کا فرض منصبی ہے۔ ذاکر صاحب کے آنے پر یہ چرچے دن رات کے ہو جاتے ہیں اور ذاکر صاحب سے ہر موضوع پر خواہ وہ عقل اول ہو خواہ ازدواج بکرر

بڑے لطف سے اور بڑے اونچے درجہ کی گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اساتذہ، طلباء، اجنبی اور احباب کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ذاکر صاحب کا مسائل کے منقح کرنے کا طریقہ دل نشین لیکن نہایت مشکل ہے۔ وہ ہر مسئلہ پر روزمرہ کے پیش آنے والے حالات واقعات کی روشنی میں گفتگو کرتے ہیں۔ عام طور پر بحث کرنے میں لوگ صرف اپنے نقطۂ نظر کو پیش پیش رکھتے ہیں اور بحث میں الجھاؤ اور بدمزگی بھی اکثر اسی طریقہ کار سے پیدا ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب گفتگو کرنے میں اپنے مخاطب اور معترض ہی کے نقطۂ نظر کو اپنا لیتے ہیں اور مسئلہ کو منقح کر دیتے ہیں۔ اس طور سے معترض کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس کی قابلیت یا اس کے اصول و عقیدہ کو ٹھیس پہنچائی گئی کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ خود مخاطب کے نقطۂ نظر کی تنقیح و توضیح اس طور سے کر دی کہ وہ اپنی بڑائی محسوس کرنے لگا اور غیر شعوری طور پر ہمیشہ کے لئے ذاکر صاحب کی ہمدردی قابلیت اور شخصیت کا شیدائی ہو گیا۔

ذاکر صاحب کی بلند نظری، دردمندی اور وسعت قلب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے مخالف بھی جب کبھی ان کی مدد کے خواستگار ہوئے تو انھوں نے نہ صرف بغیر پس و پیش کے بلکہ بڑے خلوص سے ان کی مدد کی۔ واردھا تعلیمی کمیٹی رپورٹ کے سلسلہ میں ان کو جس سفاہت اور سفاکی سے رسوا کیا گیا وہ کوئی راز نہیں ہے۔ اور کوئی قابل فخر کارنامہ بھی نہیں۔ اس رپورٹ کے

بعد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی کی طرح ڈالی۔ جس کا کام اب تک ختم نہیں ہوا ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ جس زمانہ میں اس کمیٹی پر ایک نازک دور گذر رہا تھا۔ نواب کمال یار جنگ مرحوم جب کبھی دہلی آتے تو ذاکر صاحب سے ملتے اور کمیٹی کے کام کو حسنِ خاتمہ پر پہنچانے کی سبیل ذاکر صاحب سے دریافت کرتے اور اعانت کے طلبگار ہوتے۔ واردھا رپورٹ جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف منازل سے گزر کر صوبہ متحدہ کی حکومت میں پہنچی تو کانفرنس کی حمایت میں اور کانفرنس کے ہی نقطہ نظر کو ذاکر صاحب نے وہاں کے ماہرین کے سامنے واضح کیا اور منوایا!

میں نے کہا:۔

"مرشد یہ کیا بات ہوئی؟"

تو فرمایا

"ہوئی کیا اغیار میں اپنوں کی رسوائی دیکھی نہیں جاتی"

واردھا رپورٹ سب سے پہلے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پٹنہ کے اجلاس میں پیش ہوئی۔ ذاکر صاحب آنکھوں کی سخت اذیت میں مبتلا ہو کر بمبئی گئے ہوئے تھے، جہاں ان کی آنکھوں پر آپریشن کیا گیا تھا، ڈاکٹروں کی سخت ممانعت کے باوجود انھوں نے ایک صاحب کو خفیہ طور پر بلا کر اسی حالت میں کہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور طبیعت نڈھال تھی۔ ایک خط نواب صدر یار جنگ بہادر،

سکریٹری کانفرنس کو لکھوایا، جس میں انھوں نے کمیٹی کی بنیادی سفارشات کی اہمیت بڑی قابلیت، اور بڑے ہی درد سے جتائی تھی، یہ خط ذاکر صاحب کے خلوص، قابلیت، دلسوزی اور خود انشاپردازی کا بڑا نادر نمونہ ہے۔ یہ خط عام نظروں کے سامنے آیا یا نہیں، مجھے نہیں معلوم، لیکن میں نے اسے دیکھا ہے۔ غور سے اور دیر تک پڑھا ہے، اس کا آخری شعر یہ ہے۔

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
میری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

موقع کی اہمیت اور خود لکھنے والے کی حالت کا اندازہ کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے بھی کچھ ایسے ہی عالم میں پہنچ کر یہ شعر کہا ہوگا۔ شاعری اور انشاپردازی میں بھی ایک مرحلہ آتا ہے۔ جب

ریحان دمد از مینا، رامش چکد از قلقل!

یہ بات صنعت گری کے بس کی نہیں ہے۔ یہ تو اسی وقت آتی ہے جب نظر میں وسعت، فکر میں گہرائی، دل میں سچائی اور اخلاق میں پاکی ہو!

ذاکر صاحب کے ساتھ سفر اور شاپنگ (چھوٹی موٹی چیزوں کی دوکان دوکان خریداری) کا جو لطف ہے وہ کم لوگوں کے حصہ میں آیا ہوگا۔ سفر میں آپ کم ایسے ساتھی پائیں گے جو اچھی جگہ پر خود قبضہ پانے کی فکر نہ کریں۔ ہار جیت کا کوئی تفریحی کھیل

آپ ہارنے یا جیتنے لگیں تو فوراً ظاہر ہو جائے گا کہ آپ شرافت و انسانیت کی کس منزل میں ہیں۔ شاپنگ میں معمولی ساتھی بہت جلد اکتا جاتا ہے اور چاہے وہ کتنی ہی کوشش اس کے خلاف کیوں نہ کرے اس کی بیزاری ظاہر ہو جائے گی۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب وہ اپنا کام ختم کر چکا ہو۔ اور سب سے کٹھن آزمائش تو وہ ہے جب آپ کی قسمت میں خواتین کے ساتھ شاپنگ کرنا لکھا ہو، بعضوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ آپ عورتوں کے ساتھ بغیر لنگڑائے یا روئے شاپنگ ختم کر لیں تو جہنم کے ستر گز معاف کر دئے جائیں گے۔

ذاکر صاحب کے ساتھ میں نے سفر بھی کیا ہے اور شاپنگ بھی، وہ ان دونوں کے آداب اس خوبی اور بے تکلفی سے برتتے ہیں کہ آپکا دل یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ زندگی کے یہ دونوں مشاغل اچھے مشاغل ہیں۔ شاپنگ کا تو مجھے مرض ہے جس طرح بعض خبطی علی الصباح بلا قید موسم و موقع بے ضرورت غسل کرنے یا ٹہلنے سے باز نہیں آتے اور شریفوں کے سامنے فخر کرنے سے نہیں شرماتے، اور اس روزمرہ میں خلل آجائے تو تمام دن سکرات میں مبتلا رہتے ہیں ویسے ہی اگر میں کسی نئی جگہ جاؤں اور وہاں محض قوم کے درد میں مبتلا رہوں اور شاپنگ کرنی نصیب نہ ہو تو میں بھی آپے میں نہیں رہتا اور سمجھتا ہوں کہ لوگ انسانیت پر فخر کیسے کرتے ہیں جب مجھے شاپنگ کرنے تک کی فرصت یا مقدرت نہیں!

شاپنگ کا میرا اصول یہ ہے کہ روپے کم خرچ کئے جائیں، اشیار زیادہ خریدی جائیں۔ دوڑ دھوپ زیادہ کی جائے، روپے زیادہ ہوں تو کم خرچ کرنا آسان ہے جب کم ہوں تو کم خرچ کرنا بڑا مشکل فن ہے اور بالکل نہ ہونے پر بھی خرچ کئے جانا تو خاصان خدا ہی کا خاصا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی نادر چیز نظر آ جائے تو کسی صاحب مقدرت کی تلاش کروں گا اور اس سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے لئے اسے خرید لے۔ اور میرے ذوق خواری یا خریداری کو تسکین پہنچائے!

دلی میں جب ذاکر صاحب کا ہر جگہ اور جامعہ کا صرف قرولباغ میں قیام تھا اس وقت شاپنگ کا لطف تھا۔ ہماری شاپنگ پٹری پر بیٹھ کر بیچنے والوں کے ہاں ہوتی تھی کہیں سے کوئی رنگین گلنڈر، کہیں سے مشین گزیدہ تولئے، موزے، بنیائن، کہیں سے ستم رسیدہ کیلے۔ کہیں سے پتھلین کی گولیاں خریدیں۔ گھر سے نمونے کی بیل، بیچین، اُون، بٹن وغیرہ کے ایسے نمونے لے گئے، جو کہیں نہ میسر آئیں۔ جاپانی فاؤنٹین پن کا جائزہ لیا اور نب کے آزمانے، دیکھنے میں ایسے مصروف ہوئے کہ اس سے کچھ کم ہی دیر کسی مضمون کے لکھنے میں لگا دیتے تو چاندنی چوک میں بلوہ اور قوم میں چندہ ہونے لگتا۔ فتحپوری سے چاندنی چوک ہوتے ہوئے جامع مسجد تک آئے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کباڑیوں کے ساز وسامان پر شاطرانہ نظر ڈالتے ہوئے کباب والے کی دوکان پر پہنچ گئے کچھ کھایا کچھ خرید البقیہ کو "اللہ بس باقی ہوس" کہا اور وہاں سے جامع مسجد کی ساخت اور جامع کی پرداخت

پر مرشد سے بحث کرتے ہوئے قرولباغ واپس آ گئے۔

اس تمام مدت میں مرشد اس دل و جان سے گھومنے پھرنے، کھانے پینے، لُطف اٹھانے اور لطف پہنچانے میں شریک رہے گویا ان کے نزدیک اس سے بہتر سلوک میں ان کے ساتھ نہ کر سکتا تھا۔

مئی میں لُو کی شدت تھی، علی گڈھ سے دو بجے دن کو گاڑی چلتی تھی، مرشد کا ساتھ تھا۔ میں نے کہا "سفر کیسے ہوگا لُو لگی تو کہیں کے نہ رہے"

فرمایا۔ "چلئے بھی آنکھ بچا کر نکل جائیں گے۔"

گاڑی آ چکی تھی اور چھوٹنے کے قریب تھی۔ ایک صاحب کو ٹکٹ خریدنے کے لئے روپے دئے اور ہم دونوں بھاگ کر ایک ڈبے میں بیٹھ گئے جو تنور کی طرح دہک رہا تھا،

مرشد ایک لمبا تولیہ اوڑھ کر خالی سیٹ پر لیٹ گئے۔ اس دن لُو اس شدت کی تھی کہ رہ رہ کر یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ ڈبہ کہیں کہیں سے سلگنے نہ لگے۔ مرشد کی طرف دیکھا تو سر سے پاؤں تک تولیہ میں ملفوف بڑے سکوں کے ساتھ چت لیٹے ہوئے تھے۔ صرف دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ "تھوڑی دیر کے لئے سو نہ جائیے۔"

اشارہ سے کہا نہیں۔

میں نے کہا۔ "کیوں؟"

فرمایا۔ "آنکھ جھپکی نہیں اور اُس نے مارا نہیں!"

میں نے کہا "کس نے؟"

فرمایا۔ "تُو نے!"

میں نے کہا "ٹکٹ کلکٹر آیا تو؟"

مرشد نے آہستہ آہستہ آنکھ بند کر لی!

غازی آباد کے اسٹیشن پر گارڈ ٹکٹ دے گیا۔

مرشد نے کہا۔ "تُو اور ٹکٹ کلکٹر دونوں سے بچ گئے۔ اب کیا ہو؟"

میں نے کہا۔ "اس کا جشن منایا جائے۔"

مرشد نے فوراً سنترے خریدے اور اتنے خریدے کہ قرولباغ تک ختم نہ ہوئے!

ذاکر صاحب کے بارہ میں یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ ان کی اُردو کی تقریر و تحریر بہتر ہوتی ہے یا انگریزی کی۔ طالب علمی کے زمانہ میں کالج میگزین میں رِپ RIP کے نام سے وہ کالج کی زندگی پر بڑے دلکش مضامین لکھا کرتے تھے جس کا لوگ بڑے شوق سے انتظار کیا کرتے تھے۔ انگریزی کے بارہ میں ایک بار مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر مسٹر ریمز باتھم نے کہا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی انگریزی تحریر و تقریر بالخصوص ان کی حاضر جوابی کا مقابلہ بڑا نوی

پارلیمنٹ کے بہترین اراکین سے کیا جا سکتا ہے۔ اُردو تحریر کے نمونے میں گذشتہ اوراق میں دئے ہیں۔ انگریزی کے نمونے پیش کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ علی گڑھ میں رہ کر اور اس سے باہر بھی میں نے انگریزی ہی کی اچھی تقریریں سنی ہیں۔ لیکن ہر طرح کے تکلفات سے قطعاً بری، رواں، جچی تلی، دل نشین، فکر انگیز انگریزی تقریریں میں نے ذاکر صاحب ہی سے سنی، ان کی تقریر کا ایک جملہ بھی زائد از ضرورت نہیں ہوتا اور شروع سے آخر تک استوار، شریفانہ اور ہر فقرہ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے، آپ ان کے کسی فقرہ کے ابتدائی الفاظ سن کر یہ نہیں بتا سکیں گے کہ اس فقرہ کی یہ پرداخت ہوگی یا یوں ختم ہوگا ہمیشہ وہ اس کو اس طرح ختم کریں گے کہ آپ متحیر بھی ہوں گے اور خوش بھی۔ عام تقریر کرنے والوں کی مانند وہ جسم کے کسی حصہ کو خاص طور پر جنبش یا جھٹکے نہ دیں گے لیکن بحیثیت مجموعی آپکو یہی محسوس ہوگا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں ان کے سارے جسم و جان کی کارفرمائی ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ اپنی تقریر سے اپنے گرد ویسی ہی فضا پیدا کر لیتے ہیں یا وہ خود ایک فضا ہیں جس سے ویسی ہی تقریر برآمد ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کو خاموش دیکھ کر اکثر ذہن غالب کے اس مصرعہ کی طرف منتقل ہوتا تھا ؎

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے!

ذاکر صاحب سے میرے تعلقات بڑے گہرے اور بڑے پرانے ہیں۔ لیکن قومی زندگی میں میرا انکا کبھی ساتھ نہ ہوا۔ وہ قلندر ہیں دنیا دار، انھوں نے زندگی

کے جو مصائب اٹھائے میں ان کا تحمل نہ ہو سکتا تھا۔ زندگی کے جن آستانوں پر میں نے سر جھکایا اُن آستانوں نے ذاکر صاحب کے سامنے پیہم سجدے کئے اور ٹھکرائے گئے۔ ذاکر صاحب مجھ سے تھوڑی سی بھی قربانی کرنے کو کہیں تو شاید میں نہ کر سکوں۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ انھوں نے مجھ سے اس قسم کی فرمائش نہ کی۔ میں نے ان سے بڑی سے بڑی فرمائش کی اور انھوں نے ذرہ برابر ہچکچائے بغیر اسے پورا کر دیا۔ ایک واقعہ سنئے، ۷۔۸ سال ہوئے ہوں گے ایک دن صبح کو میں اور ذاکر صاحب ناشتہ کر کے کمرہ سے نکلے تھے کہ میرے دل میں اچانک ایک خیال آیا۔

میں نے کہا۔ "ذاکر صاحب آپ فلاں صاحب سے صلح کیوں نہیں کر لیتے مجھے بڑی خوشی ہوگی"۔

ذاکر صاحب میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا "سبحان اللہ کیا مصرعہ موزوں فرمایا ہے۔ آخر آپ کو سوجھی کیا؟"

میں نے کہا۔ "اس کو کیا کیجئے، مجھے تو ایسی ہی سوجھتی ہے"

کہنے لگے "تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ آپ کہتے ہیں تو ہو جائے گا"۔

میں نے کہا "ابھی چلئے"

مرشد تیار ہو گئے۔

اور ہم دونوں وہاں پہنچے تو معلوم ہوا وہ صاحب موجود نہیں ہیں بات آئی

گئی ہوئی اور جہاں کی تہاں بھی رہ گئی۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا جن صاحب سے میں صلح کرانے گیا تھا وہ ذاکر صاحب کے جب بھی سب سے بڑے دشمن تھے اور اب بھی ہیں!

اب جب کبھی اس واقعہ کی یاد آتی ہے تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ لیکن ذاکر صاحب کی شرافت، وسعت قلب اور دوست نوازی پر نظر کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو جن دشواریوں کا سامنا ہوا اُن سے عہدہ برا ہونے کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی کوشش علی گڈھ تحریک کے ماتحت ہوئی جس کے بانی سرسید اعظم علیہ الرحمتہ اور ان کے رفقائے کرام تھے۔ اس تحریک نے ان دشواریوں کو بڑی حد تک دور کیا جن سے مسلمان اس وقت دوچار تھے۔ لیکن اس کے سامنے مسلمانوں کے مستقبل کی تشکیل و تعمیر کا کوئی نامی اور منظم پروگرام نہ تھا۔ اس تحریک کی خوبی اور خامی دونوں یہ تھی کہ اس کو حکومت کی اعانت حاصل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ اس راستہ سے سرمو انحراف نہیں کرسکتا تھا جو حکومت نے اپنے مصالح و مقاصد کو مدنظر رکھ کر مقرر کر دیا تھا۔ اس سے جو فائدہ ہو سکتا تھا مسلمان اس سے بہرہ مند ہوئے لیکن اس میں جو بنیادی خامیاں تھیں ان سے مسلمانوں کو نقصان بھی پہنچا۔ حکومت کی سرپرستی سے منصبی اقتدار

ضرور حاصل ہوتا ہے اور منصبی اقتدار سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ بھی مسلّم لیکن اس کا نقص یہ ہے کہ شخصی عظمت کی نشوونما کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ دنیا کے موجودہ ہیجان وبحران کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ شخصیت کی گرانمائگی کو اداروں کی مصلحت پر قربان کر دیا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اپنے اداروں کے غلام ہیں اور ہم میں اس کی صلاحیت باقی نہ رہی کہ ادارے ہماری ضرورت تسلیم کریں

اس تحریک کا سب سے نمایاں اور اہم ردِ عمل ترک موالات کا وہ حملہ تھا جو ۱۹۲۱ء میں ام اے او کالج پر ہوا۔ یہ حملہ کامیاب بھی ہوا اور ناکامیاب بھی، ناکامیاب ان معنوں میں کہ بنیادی طور پر علی گڑھ جہاں کا تہاں رہا اور کامیاب یوں کہ اس وقت کے بیشتر اچھے طلبا علی گڈھ سے نکل کر جامعہ میں شامل ہو گئے۔

جامعہ کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی گئی۔ ابتدا میں اس کو جو دشواریاں پیش آئیں وہ نئی نہ تھیں۔ جامعہ کا قیام بڑی ہلچل میں عمل میں آیا تھا۔ سیاست کے لیڈر بالعموم تعلیم کے لیڈر نہیں ہوتے لیکن طالب علم اور تعلیمی اداروں کو اپنا سب سے موثر اور آسان حربہ سمجھتے ہیں اور بنا لیتے ہیں۔ تعلیم کو سیاست کی باندی بنانا ایسا ہی عبث اور خطرناک ہے جیسے سمندر کی لہریں سمندر کی وسعت اور گہرائی کو اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کریں۔ سیاسی لیڈر ہمیشہ طالب علموں سے اپنا کام لیتے ہیں ان کی زندگی کو سدھارنے کی پروا نہیں کرتے۔ ان ہی وجوہ سے جامعہ کا ابتدائی دور علی گڑھ میں کامیاب نہ رہا۔ اور حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر انصاری صاحب

اسے دہلی لے گئے۔ تھوڑے دن بعد جب ذاکر صاحب اور ان کے رفقا اپنی اپنی تعلیم ختم کر کے یورپ سے ہندوستان واپس آئے تو جامعہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ جامعہ اور اس کے کارکنوں نے سیاسی سرگرمیوں سے علیحدگی اختیار کرلی۔

اس پچیس سال میں جامعہ کو کن آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ کون مصیبتیں دور ہوئیں اور کن نئی آفتوں کا سامنا ہوا۔ یہ داستان تو جامعہ کا کوئی مستند مورخ لکھے گا۔ میں تو صرف یہ دیکھ سکا ہوں کہ جامعہ کس طرح ذاکر صاحب کی شخصیت کے سہارے اور اس سے سیراب ہو کر اپنے مخصوص بلند نصب العین سے قریب تر ہوتی رہی اور باوجود صدہا دشواریوں کے اس نے نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام ہندوستان میں ایک نئی ذہنی بیداری پیدا کی اور اسے پروان چڑھایا۔ ترک موالات کی تحریک بڑی حد تک ناکامیاب اور نامقبول ہو چکی تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ جامعہ کا انجام بھی یہی ہوگا۔ مدتوں جامعہ کی مخالفت اس بنا پر ہوتی رہی کہ یا تو اس کے کارکنوں کی نیت میں فتور ہے یا ان میں عقل کی کمی ہے۔ یہ خیال اب اتنا عام نہیں ہے جتنا پہلے کبھی تھا۔ تاہم ایسے لوگوں کی اب بھی کمی نہیں ہے جو جامعہ اور اس کے کارکنوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی نیتوں میں خود کھوٹ ہے اور کچھ ایسے مخلص بھی ہیں جو جامعہ کی رفتار ترقی میں سیاسی ہنگاموں

کی گرمی اور ہنگامہ نہ پاکر اس درجہ مفید نہیں سمجھتے جتنی کہ وہ ہے۔

ہندوستان میں مدتوں کسی تحریک کے مفید، مبارک یا مستند ہونے کا معیار یہ رہا کہ حکومت کو اس سے کس درجہ اُلفت ہے اور یہی سبب ہے کہ اُن تعلیمی اداروں کو قوم اور ملک سے زیادہ اعانت ملی جو حکومت کی سرپرستی میں حکومت کے مقاصد پورا کرتے رہے اور ان تحریکوں کو فروغ نہ ہوا جو ملک و قوم کے حقیقی مقاصد کو مدنظر رکھ کر حکومت کی مداخلت گوارا نہ کرتے تھے۔ جامعہ پہلا ایسا ادارہ ہے جو حکومت کی اعانت سے مستغنی رہ کر اپنوں کی سرد مہری کے باوجود، جو اکثر شدید اور غیر شریفانہ مخالفت کی حد تک پہنچی، اپنے لئے ایک اچھی اور اونچی جگہ پیدا کر سکی!

اس درجہ تک پہنچنے میں جامعہ کے کارکنوں نے جس ایثار، قابلیت اور ہمت سے کام لیا اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ خود حکومت نے جو اس طرح کی تحریکوں کو ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے۔ جامعہ کی طرف جُھکی اور اُس نے جامعہ کی درخواست کے بغیر جامعہ کے نصاب اور امتحانات کو اپنا لیا۔ ہندوستان کی قومی تعلیمی تحریکوں کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے اور جامعہ کے بہی خواہ اور کارکن اس پر جس درجہ مطمئن اور مسرور ہوں بجا ہے!

میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ حکومت کتنی ہی ترقی پسند کیوں نہ ہو اس

میں جامد اور غیر نامی ہو جانے کی استعداد مضمر ہوتی ہے۔ قانون قواعد ضوابط روایات (جو بالعموم امتناعی ہوتی ہیں) کا اس پر اتنا بار پڑتا رہتا ہے کہ اس میں اُگنے بڑھنے کی صلاحیت کمزور ہوتے ہوتے مفقود ہو جاتی ہے۔ ریاست یا حکومت اپنے وجود کو قائم رکھنے کی جتنی درپے ہوتی ہے اتنا اپنے وجود کے جواز پر غور نہیں کرتی ریاست کی یہ معذوری ایک طور پر مفید بھی ہے۔ اگر ریاست نت نئے تجربے کرتی رہے تو سوسائٹی میں نہ استواری پیدا ہو نہ اعتماد۔ لیکن اس معذوری کی دیکھ بھال نہ ہوتی رہے تو بالآخر حکومت اس قابل نہیں رہتی کہ وہ نجی تحریکوں کو ہمدردی کی نظر سے دیکھ سکے اور رفتہ رفتہ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ ہر نئی تحریک کو اپنا دشمن سمجھنے لگتی ہے۔ افراد یا جماعت میں نئی اور نجی تحریکوں کا پیدا ہوتے رہنا ان کی صحت و توانائی کی علامت ہے۔ دوسری طرف حکومت کی صحت و سلامتی کا معیار یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان تحریکوں سے کہاں تک ہم آہنگ رکھتی ہے اور ان کی روشنی میں اپنی صلاحیتوں و ذمہ داریوں کو پرکھتی رہتی۔

جامعہ کا تعلیمی پروگرام حکومت کے مروجہ یکرخی فرسودہ پروگرام سے مختلف تھا جس کو چند باہمت اور مخلص مسلمان نوجوانوں نے قومی ضروریات اور زمانہ کے مطالبات کو مدنظر رکھ کر بڑی محنت و قابلیت سے قوم اور ملک کے سامنے پیش کیا۔ حسب دستور اس کی پذیرائی نہ ہوئی۔ لیکن نوجوان جو آگے دیکھنے اور جان کی بازی لگانے میں بوڑھوں سے فطرتاً زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اپنی جگہ پر قائم

رہے اور بالآخر وہ وقت آگیا جب نظام کہنہ نے بساط نو کے لئے جگہ خالی کرنی شروع کردی۔ دیوانے نہ ہوں تو فرزانے کہیں کے نہ رہیں۔

ایک فاضل نے جامعہ پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ قدیم کے خلاف ردّعمل ضرور ہے لیکن یہ ردّعمل اتنا کافی نہیں ہے جتنا کہ ہونا چاہئے۔ اس نقطہ نظر میں مغالطہ یہ ہے کہ مصنف نے اس پر غور نہیں کیا کہ جامعہ کا تعلیمی نظریہ انقلابی نہیں ہے اصلاحی ہے۔ مسلمانوں کا ایک مستقل اور مستند نظام تعلیم پہلے سے موجود تھا۔ جس نے صدیوں اُن ضروریات اور مطالبات کو بوجوہ احسن پورا کیا جن سے ہمارے پیشرو دوچار ہوتے رہے۔ گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال میں زمانہ غیر معمولی سرعت سے منقلب ہوا تو اس پروگرام میں بعض نئے اور اہم مطالبات سے عہدہ برا ہونے کے لئے چند باتوں میں اضافہ کرنا ضروری سمجھا گیا نہ یہ کہ اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ انقلاب بہت اچھی چیز سہی لیکن ہمیشہ اچھی چیز نہیں۔ مسلمان اپنے ماضی کی طرف سے بھی کچھ ذمہ داری رکھتے ہیں۔ ذمہ داری کا ان کا یہ احساس محض جذباتی نہیں ہے بلکہ اُس منصب کا تقاضا ہے جس پر مسلمان فائز رہے تھے اور جس پر ان کا فائز رہنا خود انسانیت کے لئے ایک بشارت ہے۔

اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ جامعہ نے مسلمانوں کا جو تعلیمی پروگرام وضع کیا ہے وہ انقلابی ہو یا نہ ہو جامع ضرور ہے جس میں مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات، علمی و ادبی

تمدنی برکات اور اخلاقی برگزیدگیوں کو ایک دوسرے سے متوازن و منور رکھنے کی ماہرانہ و مجاہدانہ کوشش کی گئی ہے۔ جامعہ کسی دوسرے ادارہ کا حریف نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایسے ادارہ کا حلیف ہے جہاں اچھا کام ہوتا ہو جہاں اچھی باتیں بتائی جاتی ہوں اور جہاں اچھا بڑا ہو نہ کہ بڑا اچھا!

ذاکر صاحب کو کوئی بُرا کہتا ہے تو میں بھوچکا رہ جاتا ہوں۔ اس کے فوراً بعد جو بات میرے ذہن میں آتی ہے وہ یہ کہ یا تو یہ شخص شیطانِ محض ہے۔ یا نادانِ محض! ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ذاکر صاحب سے واقف نہ ہوں اس کے بعد ذاکر صاحب کے بارہ میں غیر شریفانہ خیالات رکھنا یا پھیلانا شیطنت نہیں تو اور کیا ہے۔ کیسے یہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو ہر چیز پر قربان کر دیتے ہیں!

مجھے آج کم و بیش ۳۱ سال علی گڑھ میں رہتے بستے گذرے ہیں۔ میں نے علی گڑھ کی زندگی کا ہر پہلو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ اس دوران میں جتنے لوگ طالب علمی کے مراحل سے گزرے ہیں ان میں سے سب کو نہیں تو بیشتر کو جانتا ہوں اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہاں کا ہر طالب علم اپنے عہد کے تقریباً ہر طالب علم سے کم و بیش واقف ہوتا ہے۔ میں نے آج تک یہ نہ دیکھا کہ یہاں کے جن لوگوں کی طالب علمی کی زندگی جیسی رہی ہے۔ اس سے مختلف ان کی پبلک لائف ہو۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہر حال میں ہر جگہ ملیں گے ان کا

کردار بنسہ وہی ہوگا جو یہاں تھا خواہ وہ بڑے سے بڑے منصب پر فائز ہوں خواہ ادنٰے سے ادنٰے درجہ پر، یہ بات علی گڑھ کے سوا کہیں اور مشکل ملے گی۔

علی گڑھ کی خصوصیت یہاں کی اقامتی زندگی ہے۔ یونیورسٹی کے حدود سے باہر طلباء کے لئے تفریح کی کوئی جگہ نہیں۔ کوئی دریا نہیں، پہاڑ نہیں، باغات نہیں، پُر رونق بازار نہیں، تاریخی آثار نہیں۔ سال میں ایک بار نمائش البتہ ہوتی ہے جب طالب علم کباب پراٹھے کھاتے اور کبھی کبھار پولیس والوں کے "سراپا ناز" ہونے یا نہ ہونے کا جشن منا لیتے ہیں! اس لئے گھوم پھر کر ہر طالب علم کو فرداً فرداً اجموعی طور پر اپنی دلچسپی کا سامان یونیورسٹی کے احاطہ کے اندر ہی مہیا کرنا پڑتا ہے۔ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس، سوئمنگ باتھ ڈرائنگ ہال، یونین کلب، الکشن، نڈرائٹ، چارپائی الٹنا، سرسید کی فاتحہ ہی میں جوانی کی ترنگ دکھاتے نکالتے ہیں۔

علی گڑھ میں ہر طرح کے نوجوان طلباء ہر گوشۂ ملک سے آتے ہیں۔ دن رات کا ساتھ رہتا ہے۔ ہر شخص کو خواہ وہ کسی مذاق یا میلان کا ہو اپنا رفیق وہمدم مل جاتا ہے۔ علی گڑھ کی اس خصوصیت کا یہ اثر ہے کہ یہاں کا ہر طالب علم رفتار گفتار وکردار میں بے نقاب ہو کر رہتا ہے۔ خواہ وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ کوشش کرے۔ یہی سبب ہے کہ یہاں کے ہر طالب علم کا ایک ربطِ نہانی علی گڑھ سے مدت العمر قائم رہتا ہے۔ اور وہ علی گڑھ کی یاد کو اپنی زندگی کی سب سے

اچھی یاد سمجھتا ہے۔ چنانچہ کسی علی گڑھ والے کو میں پبلک لائف میں پاتا ہوں تو اس کے طالب علمی کے اعمالنامہ پر نظر ڈال کر اندازہ لگا لیتا ہوں کہ وہ کیا ہے یا کیسا ہے۔ خواہ پبلک میں اس کے اعزاز میں نعرہ ہائے تحسین بلند کئے جا رہے ہوں خواہ نعرہ ہائے نفرین!

ذاکر صاحب کے تین اور بھائیوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی، یہ خاندان تقریباً بارہ سال تک علی گڑھ کی رزم و بزم میں پورے طور بے نقاب رہا وہ بھی اس زمانہ میں جب علی گڑھ اپنے طنطنہ و دبدبہ کے نصف النہار پر تھا! جب یہاں دوسرے درجے کی کوئی بات معاف نہیں کی جاتی تھی۔ اور ہر شخص کی ہر حرکت ایسی میزان میں تلتی رہتی تھی جو بڑی ہی بے درد و بے خطا تھی۔ ذاکر صاحب کے سب سے بڑے بھائی مظفر حسین خاں مرحوم اور منجھلے بھائی عابد حسین خاں مرحوم کی شرافت قابلیت اور ذہانت کا اس عہد میں جواب نہ تھا۔ چھوٹے بھائی ؟ خاں مرحوم نے فرسٹ ایر ہی میں وفات پائی۔ اس زمانہ کے لوگ اب بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اُن سے معلوم ہو گا کہ ان بھائیوں کا معاصر طلبا اور اساتذہ میں کیا درجہ اور رکھ رکھاؤ تھا۔ اور آج تک اس پایہ کے اور طالب علم علی گڑھ سے نکلے یا نہیں!

ذاکر صاحب کے سب سے چھوٹے دو بھائیوں نے ذاکر صاحب ہی کی سرپرستی میں جامعہ میں تعلیم پائی۔ ان میں ڈاکٹر محمود حسین خاں ڈھاکہ یونیورسٹی

میں اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں پروفیسر ہیں۔ ان دونوں
کی زندگی بھی ہم سب کے سامنے ہے میں ان سارے بھائیوں کو جب ذہن میں
لاتا ہوں تو اقبال کا یہ مشہور شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔

وہی جوان ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
نگاہ جسکی ہو بے داغ ضرب ہو کاری

بذات خود میں سمجھتا ہوں کہ وہی شخص کھرا ہے جو علی گڈھ میں کھرا رہا اور وہ
یقیناً "کھوٹا" ہے جو علی گڈھ میں کھوٹا تھا!

ذاکر صاحب کے زمانہ میں بھی طالب علم وہ سب کرتے تھے جو کم و بیش آج
کرتے ہیں لیکن فرق یہ تھا کہ اُس زمانہ میں کوئی تحریک یا ہنگامہ خواہ کسی قسم کے طالبعلم
نے کسی بنا پر اٹھایا ہو اس کی سربراہی صرف وہ کرتا تھا جو معاصر طلبا میں اپنی قابلیت
سچائی اور وقار کے لئے مشہور رہوتا۔ اس زمانہ کی روایت یہ تھی کہ کچھ ہی کیوں
نہ ہو جائے۔ ایف اے تک کا کوئی لڑکا خواہ وہ کوئی ہو کسی معاملہ میں
دم نہیں مار سکتا تھا۔ تھرڈ ایر سے وہ کالج کی زندگی میں دخیل ہونا شروع ہوتا
تھا۔ اگر وہ کہیں اور سے اف اے کرکے آیا ہے تو پھر اس کی حیثیت صرف نووارد
یا Fresher کی ہوتی تھی اور اس کا رتبہ قریب قریب اف۔ اے
والوں کا ہوتا اور علی گڑھ میں جو شخص باہر سے بی اے کرکے آیا وہ شاید ہی
کبھی 'برادری' کا آدمی سمجھا گیا۔ ذاکر صاحب کسی ہنگامہ کے کبھی بانی نہ ہوئے لیکن

ایسا کوئی موقع آجاتا تھا تو تمام طلبا متفق ہو کر انھیں کو اپنا پیشوا قرار دیتے۔ ذاکر صاحب کی جماعت اساتذہ میں کبھی بڑی مان دان تھی۔ اس لئے جب کبھی وہ کسی تحریک کی سربراہی کرتے تو ان کی باتوں کو وقعت دیجاتی اور طالب علموں سے اکتانے یا بیزار ہونے کے بجائے ارباب حل وعقد ان کے حقوق اور وقار کی اہمیت تسلیم کر لیتے تھے۔

۱۹۲۰ء میں ہم سب صاحب باغ میں ام اے پریئویس اور قانون کے طالب علم تھے۔ قانون کے امتحان میں مشکل سے ۱۵ دن باقی تھے اور کورس سارے کا سارا کورا تھا۔ کئی دن سے ہم لوگوں کی توجہ اس مصیبت پر مرکوز تھی۔ ذاکر صاحب کہتے تھے پڑھنا تو ہے ہی چاہے امتحان سے پہلے پڑھا جائے چاہے بعد میں۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ناشتہ اور کھانے کا مکمل پروگرام بنا لیا جائے۔

نصیر مرحوم نے پوچھا "پروگرام سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

ذاکر صاحب نے کہا:۔

"آپ نے دو باتیں ایک ہی سانس میں کیوں پوچھ لیں۔ آپ پروگرام کے بارہ میں میری ہدایت چاہتے ہیں یا صرف مطلب دریافت کرنا چاہتے ہیں ممکن ہے دونوں ایک نہ ہوں!"

نصیر صاحب نے ذرا چین بجبیں ہو کر کہا "ذاکر، تم پڑھائی میں کھنڈت ڈالتے آئے ہو اور اب بھی اسی کے درپے ہو، اچھا بتاؤ پروگرام اور مطلب میں کیا فرق ہے؟۔

ذاکر صاحب نے کہا۔

"پروگرام تو عوام کے لئے بنایا جاتا ہے، اور مطلب اپنا ہوتا ہے۔ پروگرام تو یہ بتائے گا کہ کون کون سی چیزیں کس کس وقت کھانے پر موجود ہوں گی اور مطلب یہ ہے کہ کس کو کیا اور کتنا ملے گا پر یہ بھی تو دیکھئے کھانا تو ہر حال میں ڈائننگ ہال ہی کا ہوگا لیکن پروگرام کے ساتھ کھانے سے ذرا کھانے والوں کی آبرو بڑھ جاتی ہے!"

بڑی ردوقدح کے بعد پروگرام بھی بنا اور مطلب کی بھی رعایت رکھ دی گئی۔ پڑھائی شروع ہوئی۔ ہم تین چار آدمی ساتھ پڑھتے تھے۔ ذاکر صاحب، میں، سید نصیر الدین علوی مرحوم اور خلیل الدین مرحوم۔ بحث اس پر چھڑی کہ باآواز بلند کون پڑھے۔ اس پر کوئی نہیں تیار ہوتا تھا۔ نصیر مرحوم ہکلاتے تھے۔ ان کو پڑھنے سے معاف کر دیا گیا تھا اور بحث کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی خلیل مرحوم پڑھنے سے شرماتے تھے۔ ان کا کالج کا نام بھی گلفام ہے۔

میں نے کہا "میں پڑھنے کے لئے تیار ہوں لیکن پھر ذاکر صاحب نے قائم گنج سے جو گھی منگوایا ہے وہ دوپہر اور شام کو دال میں ڈالنے کے لئے

دو چمچے زائد لوں گا۔"

نصیر صاحب طیش میں آکر بولے "...... ہر...... ہر...... ہر گز......

نہیں...... میں...... پ پ پ...... پڑھوں گا"

میں نے کہا "تو پھر تین چمچے لوں گا۔"

ذاکر صاحب بولے "وہ کیوں"

میں نے کہا "نصیر صاحب پڑھیں گے تو مجھے ایک چمچہ سر میں بھی ڈالنا پڑے گا۔"

ذاکر صاحب نے کہا "پڑھنے کے لئے تیار ہوں لیکن صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ سب سے تین منٹ پہلے کھانا شروع کر دوں گا۔ اس کے بعد آپ لوگ شروع کریں"۔ اس پر ہر شخص بیک وقت چیخ پڑا اور بولا، ہر گز نہیں ہر گز نہیں۔ ہم پڑھنے کے لئے آئے ہیں۔ بھوکوں مرنا نہیں چاہیے!"

غرض پڑھائی شروع ہوئی۔ علوی مرحوم اور ذاکر صاحب میں کبھی کبھی قانونی نکتوں پر بڑے لطف کی اور بڑے زور شور کی بحث ہو جایا کرتی تھی ایک دفعہ بحث طوالت پکڑ گئی تو علوی مرحوم نے جھنجھلا کر کہا "اس قانون کو بناتے وقت واضع نے غالباً آپ سے مشورہ کر لیا تھا۔"

ذاکر صاحب نے فرمایا۔ "اس نے تو مشورہ نہیں کیا لیکن آپ کو میرا مشورہ یہی ہے"! اس جملہ پر مرحوم کا فرط مسرت سے ناچنا کودنا اور قہقہے لگانا اب بھی

یاد آتا ہے۔ صاحب باغ ہی میں ایک صاحب اور تھے جو اپنے آپ کو بڑا قانون داں گردانتے تھے اور قانونی بحثوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی ہائیکورٹ کی جدید ترین نظیر پیش کر دیا کرتے تھے۔ ان کے چہرہ بشرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی نظیر آسمان سے نازل ہونے والی ہے یا اللہ تعالےٰ نے ان کا رتبہ خاطر میں لائے بغیر ان کو دنیا میں بھیجدیا۔ یہ رات بھر تو قانون پڑھتے تھے اور دن بھر پڑھنے والوں کے ہاں باری باری پہنچ کر یا تو اونگھتے تھے یا ہر شخص کی قانونی سمجھ کو ہیچ پوچ ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ہم لوگوں میں بھی آبیٹھتے تھے، ان کے آجانے سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ لیکن ذاکر صاحب سب چھوڑ چھاڑ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس کا سبب کچھ تو یہ تھا کہ یہ اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح پڑھنے کا سلسلہ ٹوٹے اور کچھ اس سبب سے کہ ذاکر صاحب کو سر پھرے احمقوں سے یوں بھی بڑی الفت تھی اور ان کے ہاں میں ہاں ایسی ملاتے تھے اور اپنی طرف سے ایسی ایسی گڑھتے تھے کہ کوئی ناواقف دیکھے تو ذاکر صاحب کو معلوم نہیں کیا کہے۔

میں نے ایک دن کہا۔ "ذاکر صاحب اس غریب پر رحم کیجئے اس پر نہیں تو اس کے والدین یا اس کی آئندہ ہونے والی بیوی بچوں پر ترس کھائیے۔ ساری منزلیں تو یہ خود طے کر چکا ہے یہ آپ سہارے دے دے کر اس کو تباہی کے گڑھے میں ہمیشہ کے لئے کیوں گرا رہے ہیں۔ ایک روز ہم سب بڑے انہماک

اور لطف سے پڑھائی میں مصروف تھے کہ یہ آن پہنچے۔ اس دفعہ ذاکر صاحب بھی کسی قدر منغص ہوئے، حسب معمول نوارد نے ایک موقع ڈھونڈھ نکالا اور نکتہ چینی شروع کردی۔ گفتگو ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچی کہ نووارد نے کہا۔ ذاکر صاحب معاف کیجئے گا۔ آپ اچھی وکالت تو کر سکتے ہیں۔ لیکن جج یا واضع قانون ہونا بالکل دوسری بات ہے"

ذاکر صاحب نے کہا" یہ آپ واقعہ بیان کر رہے ہیں۔ یا بشارت دے رہے ہیں"، انھوں نے ایک ہلکے سے زہر خند کے ساتھ فرمایا۔ "دونوں" ذاکر صاحب نے جواب دیا۔"میں واضع قانون ہوتا تو آپ یقین فرمائیں، آپ دنیا میں سب کچھ کرنے پاتے قانون پڑھنے نہ پاتے اور میں جج ہونگا تو آپکو معذور قرار دے کر آپ کے لئے ہمیشہ عدالت یا حکومت کے خرچ پر کوئی معقول وکیل مقرر کرا دیا کروں گا"! علوی مرحوم نے اچھل کر نووارد کو گود میں لے لیا اور ان کی ناک کان آنکھ اور گردن کے ہکلا ہکلا کر اتنے بوسے لئے اور ان کو گود میں لے کر اس طرح ناچے کہ سارا صاحب باغ اکٹھا ہو گیا ——— نووارد نے دوسرے دن بورڈنگ ہاؤس بدل دیا!

ہمارے کمرے صاحب باغ کی دوسری منزل پر مشرقی سمت واقع تھے۔ سامنے

برآمدہ تھا، برآمدے سے اُتر کر لمبا پتلا صحن جہاں ہم سب بیٹھے پڑھنے میں مصروف تھے۔ رات زیادہ آچکی تھی۔ سامنے درختوں کے تاریک گڈمڈ ہجوم کے ٹھیک اوپر چاند برآمد ہو رہا تھا سب کی نظر یک بیک چاند پر پڑی جو اس درجہ خاموش خوبصورت، الگ تھلگ اور حزیں نظر آیا کہ سب کے سب تھوڑی دیر کے لئے دم بخود ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نامعلوم قوت نے یک بہ یک ہمارے حواس سلب کر لئے ہوں اور ہم کو ہمارے گرد و پیش سے اٹھا کر ایسے عالم میں پہنچا دیا ہو جہاں جسم و جان صرف احساس حسن و حیرت میں جذب ہو کر رہ گئے ہوں۔

ذاکر صاحب کتاب پر جھکے ہوئے تھے۔ دونوں کہنیاں میز پر تھیں اور ہاتھوں کی دو دو انگلیوں سے آنکھوں کے پپوٹے یوں کھولے ہوئے تھے جیسے "بادام" کے عوض آنکھیں نکال کے بیچنے والے تھے ؎

میں نے کہا۔ "ذاکر صاحب یہ کیا؟ ذرا چاند کی طرف دیکھئے گا!"

کہیں سے جنبش کھائے بغیر بولے۔

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں!

ثاقب لکھنوی کی ایک غزل علی گڑھ کے مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔ جس کا یہ شعر بہت مقبول ہوا اور ہر شخص کی زبان پر تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں
ابرِ بہار جانب کہسار دیکھکر!

سب ہنس پڑے اور منظر کا سحر کافور ہو گیا۔

علوی صاحب نے پوچھا: "ذاکر آخر یہ ہے کیا؟"

کہنے لگے "نہ نیند مانتی ہے نہ آپ مانتے ہیں۔ کروں کیا —— نیند آتی ہے پر نہیں جاتی!"

دوسرے ہی دن طالب علموں کا ایک ہجوم صاحب باغ پہنچا معلوم ہوا کسی مسئلہ پر طلبا نے اجتماعی طور پر احتجاج کیا ہے اور ذاکر صاحب سے درخواست کرنے آئے ہیں کہ وہ اس کی سربراہی کریں۔ ذاکر صاحب فی الفور ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ تین چار دن تک ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ایک دن یونین کے دارالمطالعہ میں مل گئے۔

میں نے پوچھا "کیسی رہی؟"

بولے "بخیر گذشت"

میں نے کہا۔ "اور جناب پڑھائی؟"

فرمایا۔ "اس ہنگامے میں جو دل و جان سے منہمک رہا۔ اس کا کچھ تو اجر ملنا چاہیئے تھا۔ اللہ نے آپ سے نجات دلائی"

"اور کھانا پینا؟" میں نے پوچھا۔

بولے، "قوم کا کام کرنے والا بھوکا نہیں مرتا"۔

میں نے کہا ذرا احتیاط رکھئے گا قومی کام کرنے والے بھوک سے

تو نہیں مرے لیکن ہیضہ میں اکثر مرے پائے گئے ہیں"۔

میں بد حظ ہو کر چلنے لگا تو لپک کر سامنے آ گئے۔ کہنے لگے للہ میرا کہا مان لیجئے۔

میں نے کہا "وہ کیا ہے؟"

فرمایا۔ "چلئے دہلی چلیں"۔

میں اکتا گیا۔ اور بولا۔ "ذاکر صاحب ہوش میں آیئے امتحان کے کے دن رہ

گئے ہیں؟"

اس بات کو اس طور سے ٹال گئے جیسے اس کی ذرہ برابر بھی اہمیت نہ تھی۔ کہنے لگے۔

پڑھ کے کیا کیجئے گا کھانے کمانے بھر کا پڑھ لیا ہے۔ احمقوں کو مرعوب کرنے کے

لئے بی۔ اے کافی ہے۔ بھلے مانسوں میں بیٹھنے کے لئے ہنسنے بولنے کی عادت

ڈالنی ہے۔ اس کے لئے دہلی کا سفر ضروری ہے"۔

میں نے کہا "اور سفر خرچ کہاں سے آئے گا؟"

بولے ـــــــ "اس کی پروا نہ کیجئے۔ خالو صاحب

کو لکھ دیا تھا۔ کہ کالج میں دق کی شکایت پھیل گئی ہے۔ کچھ

گھی اور روپے بھیج دیجئے۔ گھی تو پہلے آ گیا۔ روپیہ آج آیا ہے، بس دلی چلے

چلئے، شاہجہانپوری والے کے ہاں ڈٹ کے کھانا کھایا جائے گا۔ ہندوستانی

دواخانہ سے دوائیں خریدی جائیں گی، رات کو واپس آجائیں گے"۔

ہیں نہ مانا، ذاکر صاحب بھی دلی نہ گئے صرف کالج میں جہاں تہاں کھاتے یا گپ کرتے پائے گئے۔ امتحان سے تین چار دن پہلے صاحب باغ کی افق پر پھر سے نمودار ہوئے ہم نے ان کی پذیرائی اس طور پر کی۔ جیسے وہ سب کچھ کھو آئے تھے اور ہماری ہمدردی کے مستحق تھے اور وہ اس طور سے ملے جیسے انھوں نے ہمارے گناہوں کو معاف کر دیا ہو۔

امتحان ہوا۔ نتیجہ نکلا، ہم سب فیل۔ صرف ذاکر صاحب پاس!

زندگی میں مجھ پر اکثر ایسا وقت آیا ہے جب دل میں یہ بات آئی کہ قابلیت اور قربانی کا نتیجہ کیا جب ان کو نظر انداز کر کے دنیوی منفعت سے بہرہ وافر مل سکتا ہے۔ دنیا میں کیسے کیسے گھٹیا لوگ کیسے کیسے اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں کوئی ان کو برا کہہ کر ان کا کیا بگاڑ لیتا ہے۔ محتاط اور ایماندار رہنا اچھا سہی۔ لیکن آخر ان لوگوں کا بھی تو خیال رکھنا ہے جو میری ذات سے وابستہ ہیں میرے بعد اُن کا کیا حشر ہوگا۔ تھوڑا سا گھٹیا پن کر لیتے ہیں کوئی ہرج نہیں۔ فراغت نصیب ہوگی تو اس کی تلافی تھوڑا بہت دے دلا کر دیں گے پھر بھی بہت کچھ بچ رہیگا دیکھتے نہیں نامعقول اہل مناصب بھولے سے بھی کوئی بھلائی کر دیتے ہیں تو کوئی نہیں بھولتا اور ایماندار و مخلص جسے دولت و شہرت نصیب نہیں تمام

عمر دوسروں کے لئے مصائب جھیلتا ہے۔ لیکن اس کی خوبیوں پر اکا دکا کبھی کبھار صرف ہوں ہاں کر کے رہ جاتے ہیں اور اکتا کر اس کی یاد سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس دنیا میں لوٹ کر آنا نہیں ہے پھر اس کی لذتوں سے محروم رہنا کون سی عقلمندی ہے، وہ بھی جب لذتیں کچھ دور نہ ہوں آسانی سے ملتی ہوں اور رسوائی کا کچھ ایسا امکان بھی نہ ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں بزدل ہوں اس لئے برائی سے ڈرتا بھاگتا ہوں!

اس کیفیت کا رد عمل ہوتا ہے۔ اور میرے سامنے ذاکر صاحب آجاتے ہیں۔ میں اُن بڑی ہستیوں سے بہتوں سے زیادہ واقف ہوں جن کی خوبی، نیکی اور بہادری سے مذہب تاریخ یا افسانوں کے اوراق لبریز ہیں۔ ان کی شہرت یا برگزیدگی کو میں مانتا ہوں۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کا اصلی یا فرضی وجود کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں ملتا ہے بلکہ اس کی جھلک مجھے اپنے دوستوں میں ملتی ہے۔ ان دوستوں میں جن کی زندگی کے ہر پہلو سے میں پورے طور پر آشنا ہوں جن کو میں دنیا کے ہر کاروبار میں اسی طرح منہمک پاتا ہوں جس طرح میں خود ہوں جن کے سامنے وہی کمزوریاں یا لذتیں آتی ہیں جو میرے سامنے آتی ہیں وہ ان کو مسکرا کر (ڈر کر نہیں) نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کمزوریوں سے میرا سابقہ ہوتا ہے تو میں علانیہ یا چھپ کر ان میں مبتلا ہو جاتا ہوں اور طرح طرح کے جتن کرتا ہوں اور نظر انداز کر دیتا ہوں تو تمام عمر ان کو حسرت سے یاد کرتا رہتا

ہوں۔ لیکن وہ دنیا کو نہ دار المحن سمجھتے ہیں نہ دار فانی۔ اس کو صرف دنیا سمجھتے ہیں۔ ایسی دنیا جس کو وہ آخرت سے بھی اعلیٰ و ارفع بنانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

مجھے اطمینان ہونے لگتا ہے کہ میں نے اپنے لئے جس زندگی کا انتخاب کیا ہے اس میں خسارہ نہیں ہے۔ میرا جن لوگوں کا ساتھ ہے وہ بُرے نہیں ہیں۔ زندگی کا ماحصل یا انسانیت کا مقصد یہی نہ ہے کہ آدمی نے جو زندگی یا زمانہ پایا اس کو اپنے حسنِ خیال یا حُسنِ عمل سے خواہ وہ اتنا کم ہو کہ حساب میں نہ آئے بہتر و برتر بنائے۔ دنیا کو بہتر و برتر بنانے کے لئے لازم ہے کہ انسان خدمت لینے سے زیادہ خدمت کرے۔ یہ وہ عبارت ہے جو اس کو نفس کے تمام ناروا مطالبات سے باز رکھتی ہے اور مسرور و مطمئن بناتی ہے۔ ہر وہ بات اور ہر وہ فعل جو انسان کو اس عبادت سے باز یا محروم رکھے ظلم یا گناہ ہے! انسان مال اور کھال ہی میں مست نہیں رہتا کردار میں بھی مست رہ سکتا ہے!

ذاکر صاحب وہ سب کر سکتے تھے اور پا سکتے تھے جو آج کل کے ہمارے بڑے آدمیوں کو نصیب ہے۔ ان کو بڑی سے بڑی نوکری مل سکتی تھی، وہ عوام کو بہکا کر یا بھڑکا کر شریفوں پر دنیا تنگ کر سکتے تھے۔ وہ رشوت لے یا دے کر دولت و اقتدار حاصل کر سکتے تھے۔ خدا اور رسول کے نام پر خانقاہیں

یا یتیم خانے قائم کر کے غریبوں کی کمائی اور ناموس لوٹ سکتے تھے، وہ ہر طرح کے فسق و فجور میں مبتلا رہ کر بھی اپنی قوم کے آخری نجات دہندہ قرار دئے جا سکتے تھے۔ ذاکر صاحب کی ذہنی استعداد جس پایہ کی ہے اُس سے ان کے بدترین دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے۔ وہ اس استعداد کو اپنے نفس کی خاطر بے لگام کر کے وہ تمام باتیں حاصل کر سکتے تھے جن کو ہم رشک و حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک دن وفات پا جاتے ہیں! نفس کے اس بے پناہ عفریت کو جس کے ادنیٰ اشارہ پر ہم اپنی ہی نہیں دوسروں کی بھی قیمتی سے قیمتی متاع تلف کر دینے پر آمادہ رہتے ہیں اور اسے نصیبے کی یاوری یا قوم کی بیداری سمجھتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے کس طرح زیر کیا اور کیوں کیا اسے کون سمجھے گا اور کیوں سمجھے گا۔ جب اس کے سمجھنے سے نجس مقاصد اور ملعون نیتیں بے نقاب ہوتی ہوں!

ذاکر صاحب نے سب سے الگ ہو کر لیکن سب کے لئے جامعہ کی بنیاد ڈالی۔ محنت سہی، بے کسی دیکھی، گالیاں سُنیں، رسوائی اٹھائی، انتظار جھیلا لیکن منہ نہ توڑا مسکرانے سے باز نہ آئے، دشمن سے نہ ڈرے نہ اسے دھتکارا، اس نے مانگا تو دے دیا، اُس نے چھڑا لیا تو جانے دیا۔ خود سہتے رہے جامعہ کو سپر نہ بنایا، اس کو صرف سنوارا، وہ انتظار کرنے سے گھبرائے نہیں۔ اس لئے کہ اچھے اور بڑے کام کرنے میں انتظار، کی منزل سر سے

سے مفقود ہوتی ہے، انجام کا ڈر نہیں ہوتا۔ کام و انجام ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ انجام یا انعام کا جو یا وہ ہوتا ہے جس کو اپنے کام پر نہ ایمان ہو نہ اطمینان، سب سے بڑا اور سب سے اچھا انعام وہ ہے جو ہم خود اپنے آپ کو دے سکیں نہ وہ جو دوسرے سے ہے۔

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ جامعہ کا پروگرام لمبا ہے۔ اس سے نتائج دیر میں برآمد ہوں گے۔ ملک کے حالات اس کے مقتضی ہیں کہ سیاسی سرگرمیوں میں جلد سے جلد حصہ لیا جائے۔ اس سے جہاں اور فوائد ہیں، وہاں جامعہ کے کاموں کو بھی تقویت پہنچے گی۔ ملک و قوم کی حالت روز بروز دگرگوں ہو رہی ہو تو لمبے پروگرام کو اپنی توجہ و محنت کا تنہا مرکز بنانا مناسب نہیں۔

لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ سیاسی سرگرمیاں بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان میں صحت اور استواری اسی وقت آتی ہے جب ان کی آبیاری کے لئے ہمارے ذہنوں میں صاف اور شفاف پانی کے گہرے اور نہ سوکھنے والے سوتے ہوں یہ سوتے تعلیم ہی سے منکشف بھی ہوتے ہیں اور پیدا بھی۔ بازاروں اور اخباروں میں قومیں بنتی نہیں بدنام ہوتی ہیں۔ تعلیم کو سیاست پر قربان کرنا تنگ نظری اور خود غرضی ہے۔ سیاست کو تعلیم کی باندی ہونا چاہیئے۔ تعلیم میں نتائج کی دیر سویر بے معنی سی بات ہے

اونچے درجہ کی تعلیم گاہوں میں معلم اعلیٰ کی حیثیت جس کے سپرد ادارہ کا نظم ونسق بھی ہو دوسرے اداروں کے افسروں کی حیثیت سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہوتی ہے۔ تعلیم گاہوں میں ایسے عہدہ کی حیثیت منصبی، نہیں ہوتی علمی، ذہنی اور اخلاقی ہوتی ہے۔ یونیورسٹیوں میں اونچے درجہ کا علمی و تعلیمی کام ہوتا ہے۔ یہاں کا ہر معلم اپنے فن کا امام ہوتا ہے۔ خواہ اس کا عہدہ یا اس کی تنخواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ ایسی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ افسر اعلیٰ کا ذہنی اور اخلاقی درجہ اپنے ماتحتوں یا ساتھ کام کرنے والوں کے علمی و اخلاقی درجہ سے واضح طور پر بلند نہ ہو تو کم درجہ کا کسی طرح نہ ہو۔ ایسی تعلیم گاہوں میں منصب، دولت، امارت، رسوخ کی کوئی اہمیت نہیں۔ برخلاف سرکاری اداروں کے جہاں منصب ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ کلکٹر ہزار نااہل ہو اور تحصیلدار کیسا ہی قابل کیوں نہ ہو، ہر حال میں اول الذکر ہی کا بول بالا رہے گا۔ یونیورسٹیوں میں علمی اور ذہنی صلاحیتوں کا مقابلہ صرف علمی و ذہنی صلاحیتوں سے ہوتا ہے۔ زور بازو سے کام نہیں چلتا۔ یہاں زور بازو یا دغل فصل، سے کام لینا نری حماقت ہے جس کو بڑے سے بڑا معاف کرنے والا بھی معاف کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔

ذاکر صاحب جامعہ کو ۲۵ سال سے چلا رہے ہیں۔ اس دوران میں جامعہ اور جامعہ میں کام کرنے والوں کو طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ دونوں پر مسلسل اور بے پناہ غیر شریفانہ حملے ہوئے۔ لیکن نہ یہاں کوئی اسٹرائک ہوئی

نہ کوئی بددل ہوا نہ جامعہ کو چھوڑ کر شہرت یا روزی کمانے کہیں اور گیا۔ یہاں ایسے لوگ بھی نہ تھے جن پر رزق اور موت کے دروازے بند رہے ہوں اور جامعہ کے علاوہ کہیں اور ٹھکانا نہ ہو بلکہ ان میں سے اکثر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ایسی شہرت رکھتے تھے کہ ہندوستان کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں ان کی پذیرائی احترام کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ یہ صرف ذاکر صاحب کی بلند و برگزیدہ شخصیت تھی جس نے جامعہ کے تار و پود کو نہ صرف بکھرنے سے بچایا بلکہ اس کو مربوط و مستحکم کر دیا!

جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہمہ وقت یہ دیکھتا تھا کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کر رہا ہے اور ذاکر صاحب کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ سارا قضیہ اسی ترازو میں تُل کر ختم ہو جاتا۔ ذہنی قابلیت میں جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا۔ ذاکر صاحب کی ذہنی قابلیت کے سامنے سر جھکا دیتا اپنے ایثار، قربانی اور اخلاقی فضائل کا کسی کو خیال آتا تو وہ یہ پاتا کہ ان فضیلتوں میں بھی ترازو کا پلڑا ذاکر صاحب کی طرف جھکتا ہے۔ خاندانی شرافت و نجابت یا سوشل اور سرکاری تعلقات یا رسوخ پر کسی کو ناز ہوتا تو وہ یہ پاتا کہ ان کا سردار خاندانی اعتبار سے بھی زر خالص ہے اور اس کے تعلقات بھی زیادہ وقیع زیادہ مستحکم اور زیادہ وسیع ہیں۔ محنت کرنے اور فرائض سے عہدہ برا ہونے کو دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ذاکر صاحب جیسا محنت شاقہ کرنے والا اور اپنے فرائض پر آرام و تفریح کو قربان کر دینے والا حلقہ میں

ان جیسا کوئی اور نہ تھا۔ کسی کو اپنے ذوق ذہانت وفطانت کا دھیان ستاتا تو وہ دیکھتا کہ اس وادی میں بھی امام ذاکر صاحب ہی ہیں۔ کلرک یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرتے ہیں۔ چپراسی یہ پاتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ دوڑ دھوپ اٹھاتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں بچہ یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب جیسا بچہ کوئی نہیں، جوان یہ محسوس کرتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ جوان ہیں اور بوڑھا یہ جانتا کہ جب بڑھاپا ذاکر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا ہے۔ تو پھر وہ بڑھاپے کو کیوں خاطر میں لائے۔

ان کے علاوہ ہر شخص کا عقیدہ تھا کہ ذاکر صاحب دوسروں کے فائدہ کے لئے جان کھپاتے ہیں، اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد اور اس کی عزت وفراغت کو اپنی عزت وفراغت سمجھتے ہیں تو پھر کون ایسا ہو سکتا تھا جو ذاکر صاحب کو چھوڑ کر اپنے ضمیر کی سرزنش گوارا کرتا۔

یونیورسٹی میں اچھے اور ذہین طلبا سے ملنے، اور ان کے ساتھ طبع آزمائی کرنے میں جو لذت ہے وہ مجھے کسی اور چیز میں نہیں ملتی۔ اس سے خود طالب علم کو کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہیں میں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا، زندگی کی بعض قباحتوں یا روز بروز کی یکسانیت سے جب طبیعت منغض یا پست ہونے لگتی یا یہ دیکھتا

کہ کھنگی اور تھکن میری طرف رینگتی بڑھتی آرہی ہے تو مجھے یہ ضرورت محسوس ہوتی کہ کسی اچھے اور ذہین طالب علم سے گفتگو کی جائے اس وقت صحیح اندازہ ہو سکے گا کہ میں واقعی حق بخشوا چکا ہوں یا

اب بھی گر پڑ کے ضعف سے نالے

ساتواں آسمان لیتے ہیں!

گفتگو کے دوران ہی میں مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ "غریب نسیتم بیمار ہستم"

لہ کابل کے ایک افغان سوداگری کے سلسلہ میں ہندوستان کی ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اتفاق سے بیماری نے صاحب فراش کر دیا۔ تمام دن چارپائی پر پڑے رہتے تھے اور بھٹیاری کچا پکا جو کچھ سامنے رکھ دیتی تھی اسے فرو کر لیا کرتے تھے۔ بھٹیاری دوسرے مسافروں کا بھی کھانا پکاتی تھی اور حسب دستور قدیم کسی کا آٹا کم کر دیا کسی کی رُٹی اڑا دی، کسی کی بوٹی غائب کر دی۔ اس پر مسافروں سے بھٹیاری کی چخ چخ ہوتی۔ ایک دن بھٹیاری نے ان کو مخاطب کر کے کہا تم لوگ کیسے بڑے ہو کہ جینے نہیں دیتے۔ ایک ان غریب کو دیکھو کہ دن بھر چپ چاپ پڑے رہتے ہیں جو سامنے رکھ دیا شکر کر کے کھا لیا۔ خان سے نہ رہا گیا لیٹے ہی لیٹے للکارا۔ قطامہ با غریب نسیتم بیمار ہستم!"

اچھی کتاب پڑھنے اور اچھے طالب علم سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ ذہن میں بالیدہ ہونے پرواز کرنے اور نئی سے نئی وادیوں سے گزرنے کی استعداد باقی ہے اور دل و دماغ پر تاریکی کے جو بادل چھا گئے ہیں وہ عارضی ہیں دائمی نہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مجھ میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ میں بالعموم ایسے طالب علم کی تلاش میں نہیں رہتا اور خود ایسے طالب علم کے ہاتھ نہیں آتا۔ اس لئے کہ اقبال کے زمانہ تک تو نوجوانوں کے اعصاب پر عورت سوار تھی میرے زمانہ میں سواری یا کرایہ سستا پاکر ان پر تسمہ پا لیڈر بھی سوار ہو گئے۔ مجھ میں نہ اتنی سکت کہ میں اس تگڈم کو اپنے اوپر سوار کرلوں دوسری طرف انسانیت گوارہ نہیں کرتی کہ میں خود ان پر سوار ہو جاؤں!

میں اپنے اچھے اور صاحب توفیق طالب علم کو اکثر یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ کبھی نہ کبھی ذاکر صاحب سے مل ضرور آئے اور یہ اس لئے کہ میں جس متاع کو اپنے لئے گرانمایہ سمجھتا ہوں اس میں اپنے ان عزیز طلبا کو بھی شریک کرلینا چاہتا ہوں جن کو عزیز سمجھتا اور محترم گردانتا ہوں بحیثیت ایک معلم کے میرا عقیدہ ہے کہ نوجوانوں کو جتنی صحیح و صالح تربیت بلند و برگزیدہ شخصیتوں سے ملتی ہے اتنی کتابوں اور لکچر سے نہیں ملتی۔ مطالعہ سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے جو بے کار بھی ہو سکتی ہیں اور خطرناک بھی اگر کوئی بڑی شخصیت ان معلومات کو اس طالب علم کے لئے

مفید مطلب نہ بنا دے۔

معلومات کی مثال ریگ صحرا سے بھی دی جا سکتی ہے اور بھک سے اڑ جانے والے مادہ سے بھی، یہ کام صرف اچھے معلم یا رہبر کا ہے کہ وہ ذرہ سے الماس نکال لینے کی اور بارود سے تباہی کا امکان دور کر کے مفید طاقت حاصل کرنے کی سبیل بتائے۔ کچھ دنوں سے نوجوانوں میں جو بے راہ روی نظر آ رہی ہے اس کے اسباب بہت کچھ ہو سکتے ہیں لیکن ایک بات جو مجھے نہایت واضح طور پر نظر آئی وہ یہ ہے کہ طلبا کو زیادہ سے زیادہ اور انواع و اقسام کی معلومات فراہم کرنے کی خطرناک حد تک سہولتیں میسر ہیں لیکن اُن معلومات کو اُن کے لئے مفید بنانے یا ان کی گزند سے بچانے والے اچھے معلم یا رہبر نہیں ہیں۔ صاحب نظر کے ادنیٰ اشارہ سے وہ منزلیں چشم زدن میں طے ہو گئی ہیں جو نظروں سے پوشیدہ رہی ہیں یا جن تک پہنچنے میں صدہا دشواریاں خطرے اور مایوسیاں تھیں۔

طالب علم ذاکر صاحب سے مل کر آتا ہے تو اُن کے اور جامعہ کے بارے میں ایسے خیالات و تاثرات کا اظہار کرتا ہے جیسے زندگی میں اسے کوئی اچھی اور غیر متوقع چیز مل گئی ہے۔ ذاکر صاحب نے ان طلبا سے مذہب اور سیاست پر کبھی گفتگو نہ کی، وہ کہتے تھے کہ ان مباحث پر مولوی اور لیڈر بحث کرنے کے لئے کیا کم ہیں۔ میں تو صرف یہ دیکھتا ہوں کہ طالب علم کے قویٰ ذہنی کس نوعیت کے ہیں، اس کے ذہن و اخلاق میں کس نوعیت کا ربط ہے اس نے کیا پڑھا ہے، کن چیزوں سے

متاثر ہے، اس میں کیا صلاحتیں پوشیدہ ہیں وہ اپنی صلاحیتوں کے بس میں ہے
یا اُن صلاحیتوں کو اپنے بس میں رکھ سکتا ہے۔ اس پر میں اپنا ٹھپا نہیں لگاتا بلکہ اس
کو اپنا ٹھپا متعین کرنے میں اس کی مدد کرتا ہوں۔ اور میں جانتا ہوں۔ مرشد
کا "کھل سم سم" یہی ہے!

جامعہ کو دیکھنے کے لئے بڑے سے بڑے ماہرین تعلیم اور مبصرین فن وقتاً فوقتاً
آتے رہتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اس کے بارہ میں اچھے سے اچھے خیالات کا
اظہار کرتا ہے۔ ایک دن میں نے ذاکر صاحب سے پوچھا کیوں مرشد یہ جتنے غریب
جامعہ کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں ان کو ساری چیزیں دکھاتا بتاتا کون ہے فرمایا
"بالعموم میں ہی ہوتا ہوں!"

میں چپ ہو گیا، ذاکر صاحب چونکے اور پوچھنے لگے "اس سوال کا مقصد
کیا ہے۔؟"

میں نے کہا۔ "کوئی مقصد نہیں" بقول آپ کے میں نے یہ بات محض
معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے پوچھ لی"۔

ذاکر صاحب نہ مانے اور بولے:۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے ذہن میں حسب معمول کوئی فتنہ
بیدار ہوا ہے۔ آپ کو بتانا پڑے گا"۔

میں نے کہا۔ ”مرشد بات کوئی نہیں ہے۔ آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کبھی بہرائچ گئے ہیں“؟

بولے۔ ”نہیں“۔

میں نے کہا۔ ”خیر آپ نے غازی میاں کا میلا تو دیکھا ہوگا“۔

بولے۔ ”جی میں نے دیکھا ہو یا نہیں آپ اپنا مطلب سنائیے“۔

میں نے کہا۔ ”ارے وہی جہاں ڈفالی لہک لہک کر گاتے پکارتے ہیں:

اندھے پائیں گے چشم (چشم) کوڑھی پائیں گے شریر (جسم)

میاں سے مرادی مانگ لے!

ذاکر صاحب فرطِ انبساط سے اچھل پڑے اور بولے، کیا غزل سنائی ہے جھک ماریں تمام دنیا کے شاعر مصلح اور لیڈر اس کے آگے۔ تھوڑی دیر تک اس پر گفتگو رہی، اس کے بعد بولے ”لیکن اس مبتدا کی خبر تو سنائیے“۔

میں نے کہا۔ ”مرشد میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اگر آپ کے ساتھ غازی میاں کے میلے میں دنیا کا بڑے سے بڑا مفکر ہو اور آپ ذرا جی لگا کر اسے یہ بتا دیں کہ یہ میلہ نہیں ہے بلکہ اقوامِ عالم کی پارلیمنٹ ہے جہاں مفکرین و مصلحین عظم متفق و متحد ہو کر انسانیت کو اوج سعادت و کامرانی پر فائز کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں تو وہ بے چون و چرا تسلیم کر لے گا اور تمام عمر اپنی قسمت پر ناز کرے گا کہ

آپ کے توسل سے وہ دنیا کے سب سے نئے سب سے بڑے اور سب سے مبارک تجربہ سے آشنا ہوا!"

مرشد نے اس کے بعد کیا کہا اور مجھے کیا سننا پڑا کاش ہم میں سے ہر ایک سُنتا۔ لیکن وہ باتیں ایسی نہیں ہیں جو ہر کس و ناکس کو بتائی سنائی جائیں۔ میں البتہ بہت خوش ہوا کہ میرا مقصد پورا ہوا۔ یعنی مرشد پہ جلال طاری ہوتا ہے تو کیا ہوتا ہے!

اس تمام داستان کے لکھنے کے بعد مجھے اپنے عزیز و محترم دوست کی تنبیہہ یاد آئی، ذاکر صاحب پر میں نے وقتاً فوقتاً جو کچھ کہا اس پر میرے ان دوست نے ایک بار مجھ سے کہا "آپ ذاکر صاحب کے بارہ میں یہ کیا اناپ شناپ لکھ ڈالتے ہیں ان کے وقار کا تو لحاظ رکھا کیجیے۔ لوگ ان کے بارہ میں کیا خیال کریں گے۔ آپ کو تو تفریح کی سوجھتی ہے لیکن ذاکر صاحب کی رسوائی ہوتی ہے!"
میں نے عرض کیا۔ "آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ لیکن آپ سے یہ شکایت ہے کہ آپ نے ذاکر صاحب کے وقار کا تو لحاظ رکھا اور میرے وقار کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ آپ کے بارہ میں تو مجھے معلوم نہیں کہ آپ ذاکر صاحب کے وقار کو کن باتوں پر مبنی سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک تو ان کا وقار اُنھی باتوں پر مبنی ہے جو میرے ذہن و دماغ میں میرے ارادے سے بے نیاز، بارہا ہزار ان

شیوۂ دلبری بے محابا د بے حجاب آتی ہیں اور نوک قلم سے ٹپک پڑتی ہیں!"

یہ باتیں، نہ میری ہیں نہ ذاکر صاحب کے لئے ہیں۔ معلوم نہیں کس کی ہیں اور کس کے لئے ہیں۔ لیکن ہیں سب کچھ!

الہ آباد کا سفر تھا، ہندوستانی اکیڈمی یوپی سے ذاکر صاحب نے معاہدہ کرلیا تھا کہ معاشیات پر وہ ایک مقالہ پڑھیں گے۔ ذاکر صاحب دلّی سے روانہ ہوئے۔ میں علی گڈھ سے ساتھ ہولیا۔ انٹر کلاس میں ذاکر صاحب ملے میں بھی جا بیٹھا، بڑی بھیڑ تھی۔

بولے۔"رشید صاحب معاملہ دگرگوں معلوم ہوتا ہے۔ مقالہ لکھا نہیں ہے۔ خیال تھا رات بھر کا سفر ہے۔ ریل میں بیٹھ کر لکھ ڈالوں گا۔ اب تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صبح تک زندہ ہی نہ رہیں گے۔ پھر کیا ہوگا۔؟"

میں نے کہا"مرشد فکر کی بات نہیں ہے چلئے سکنڈ کلاس میں چلیں"۔

بولے۔"اور کرایہ؟"

میں نے کہا"روپئے تو میرے پاس بھی نہیں ہیں لیکن یہ علی گڑھ ہے آپ اُترے تو روپئے کا کوئی انتظام کرلیا جائے گا"۔

ہم دونوں اسباب اتروا کر سکینڈ کلاس کی طرف چل نکلے پلیٹ فارم پر پہلے شناسا کو میں نے دونوں ٹکٹ دئے اور یہ کہہ کر کہ اسے بدل کر سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ لائیے اور

روپے میرے گھر جاکر لے لیجئے گا۔ ہم دونوں سیکنڈ کلاس میں جا بیٹھے ٹکٹ مل گئے، تو مرشد نے کہا "اس سے کیا ہوتا ہے کچھ زائد روپئے بھی تو درکار ہونگے سفر میں ٹکٹ کلکٹر ہی نہیں ہوتے خوانچہ والے بھی ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کھانا میرے ساتھ ہے" اُکتا کر بولے "وہ تو میں جانتا ہوں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ خوانچہ والے کی بھی تو دلداری کرنی پڑیگی"

میں نے کہا۔ "اس کی ذمہ داری بھی میں لیتا ہوں۔ لیکن ایک شرط ہے"

"بولے۔ "وہ کیا؟"

میں نے کہا۔ "دہی بڑے نہیں خریدے جائیں گے۔ کابلی چنے والا پاس نہ آئے گا، کتاب اور اخبار والے کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھے گا اور سب سے بڑی اور پہلی شرط تو یہ ہے کہ کمپارٹمنٹ میں آپ نہ چھوٹے بچوں سے یارانہ کریں گے اور نہ کسی احمق سے اس طور پر گفتگو کریں گے کہ عمر بھر وہ اپنے آپ کو افلاطون سمجھتا رہے۔"

بولے "سب منظور۔"

تھوڑی دیر بعد بولے "رشید صاحب کھانا تو کھا ہی لیا جائے۔ ورنہ دھیان بٹا رہے گا۔ ایسی حالت میں سنجیدگی اور خلوص سے گفتگو نہیں کی جاسکتی" کھانا نکالا گیا۔ اتنے میں ہاتھرس کا اسٹیشن آگیا۔ چاقو بیچنے والا گذرا تو بولے "ایک چاقو کیوں نہ خرید لیا جائے۔"

میں نے کہا۔ "یہ کیوں؟"

بولے "ہاتھرس کے چاقو ہاتھرس سے باہر تو اکثر خریدنے کا اتفاق ہوا خود ہاتھرس میں خریدنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا۔"

میں نے کہا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔"

کھانے سے فارغ ہو کر اطمینان سے بیٹھے تھے کہ ٹونڈلہ آ گیا۔ میں اوپر کی برتھ پر بستر درست کر کے نیچے آیا۔ کیا دیکھا کہ مرشد دال موٹھ اور پیٹھے والے سے سودا چکا رہے ہیں۔

میں نے کہا۔ "یہ کیا"

بولے "کچھ نہیں معلومات میں اضافہ کر رہا ہوں۔ آپ بھی آ جائیے۔"

یہ سماں دیکھ کر میرا دل بھی پسیجنے لگا۔

مرشد بھانپ گئے۔ بولے "سفر طویل ہے۔ معلوم نہیں کیسے کیسے نامعقول لوگوں سے راستہ میں سابقہ رہے۔ ایسی حالت میں اعتماد و تقویت کا کچھ نہ کچھ سامان کر لینا چاہیئے۔ میں کب کہتا ہوں ہر چیز کھا لینے ہی کے لئے خریدی جاتی ہے۔ لطف ہمرہی کے لئے بھی تو خریدی جا سکتی ہے۔"

دال موٹھ اور مٹھائی خرید لی گئی

پھر بولے۔ "آیئے تھوڑا اس کو جھوٹا بھی کر دیں ورنہ ارواح خبیثہ کا ان پر سایہ ہو جائے گا۔" یہ مرحلہ بھی طے ہوا تو میں نے کہا "مرشد مزخرفات

ختم اب مقالہ لکھنا شروع کیجئے"۔ بولے "بیٹھئے بھی، آرام کی جگہ ملی ہے۔ خوب کھا پی لیا ہے۔ موسم کتنا معتدل اور سماں کتنا متوازن ہے"۔

میں نے کہا۔ "تو پھر؟"

بولے، جی میں آتا ہے کہ کنجشک بنوں![1]

اس پر ہم دونوں بے اختیار ہنس پڑے، دیر تک اُس زمانہ کی یاد کرتے رہے جب یہ اشعار خاص خاص موقعوں پر پڑھے جاتے تھے اور لطف اٹھایا جاتا تھا۔ بالآخر میں نے کہا۔ "مرشد اب تفریح ہو چکی بس مقالہ لکھنا شروع کر دیجئے۔ اور میں جا کر سوتا ہوں"

مرشد نے کہا۔ "یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ سوئیں اور میں جان کھپاؤں، اچھا میں لکھتا جاؤں اور آپ پڑھتے جائیں"۔

میں نے کہا۔ "اس سے کیا فائدہ؟"

بولے۔ اس سے میرا لکھنے کا مومینٹم (Momentum) قائم رہے گا۔ موقع موقع سے جہاں تہاں آپ "اندوہگیناں"[2] وغیرہ بڑھا دیجئے گا!

اس پروگرام پر تھوڑی دیر تک عمل رہا پھر میں سو گیا۔ صبح اٹھا تو مرشد غالباً دس صفحے فل سکیپ کے لکھ چکے تھے میں اُسے پڑھ گیا۔

کہنے لگے "آج کے لئے کافی ہو گیا۔ کل کے اجلاس کے لئے

---

[1] زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ میں ذاکر صاحب نے ایک بار ہندوستان

پھر لکھ لوں گا۔"

پھر بولے۔ "آپ نے دیکھ لیا۔ کیسا پایا؟"

میں نے کہا۔ "مرشد کیا کہنے، کمال کیا ہے۔"

بولے۔ "نہیں سچ بتائیے۔ کیسا رہا۔ کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کیجئے۔"

میں نے کہا "نہیں مرشد ایمان سے کہتا ہوں خوب لکھا ہے۔ دوران مطالعہ میں اکثر مقامات ایسے آئے جہاں میں نے بڑی حسرت سے یہ محسوس کیا کہ بس میرے میں ذرا سی عقل اور ہوتی تو میں یہ بھی سمجھ جاتا۔"

الہ آباد میں اس مقالہ کی دھوم مچ گئی۔ بڑے سے بڑا افلاطون جمع تھا ہر ایک یہی کہتا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو جیسا سُنا تھا اس سے بھی اونچا پایا۔

میں ایک کابلی کے (اللہ بہتر جانتا ہے!) تصنیف کردہ کچھ اشعار سُنائے تھے جو بہت مقبول ہوئے اور زبان زد ہو گئے تھے

وہ اشعار یہ ہیں ؎

خوشے انگر (انگور) کے لگے ہوں گے۔ پانی نہروں میں بھرے ہوں گے

جی میں آتا ہے کہ گنجشک بنوں اڑ کے پچھوں (پہنچوں) اپنی ولایت!

۵۲ طالب علمی ہی کے زمانہ کی بات ہے۔ میں ذاکر صاحب اور مولانا سہیل ساتھ تھے۔ مولانا شاعری کرتے تھے اور میں گل منزل پر مقیمین

لکھتا تھا۔ ایک دن ذاکر صاحب نے کہا کہ وہ بھی کچھ لکھنا شروع کرینگے بشرطیکہ انکو

مضمون کے دو چار عنوان بتا دئے جائیں۔ کئی دن تک عنوان کے چکر میں رہے

ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ لائبریری سے "افلاطون کی (Platos Republic)

ریاست" اٹھائے لئے آرہے ہیں۔ فرمایا عنوان نہ بتائے آپ لوگوں کی ضد میں ترجمہ

کرونگا۔ چند ہی دنوں میں کافی ترجمہ کر ڈالا ترجمہ بے نظیر تھا اسکی ایک مختصر سی داستان ہے،

مولانا سہیل اس زمانہ میں کالج میں جو ذہانت، شاعری، تقریر، قابلیت میں سب سے

اونچے سمجھے جاتے تھے ساتھ ہی ساتھ کالج میں فتنہ نمبر ا بھی خیال کئے جاتے تھے اس

زمانہ کا بڑے سے بڑا فرعون بھی خواہ وہ کسی فن کا فرعون ہامان یا شداد و نہ ہو تا مولانا

کے سامنے کان پکڑ کر کہتا یا "استاد" ایک دن ذاکر صاحب نے مولانا کو یا مولانا نے ذاکر صاحب کو دھر لیا

ترجمہ سنانے کا اہتمام ہوا مولانا ایک کرسی پر پاؤں اٹھا کر اکڑوں بیٹھے اس پر بھی مطمئن

نہ ہو کر اپنی کہنیوں کو رانوں کے درمیان کر کے ہتھیلی اور انگلیوں کو رخسار دل

سے یوں چپکا دیا جیسے کسی شلف میں کتابیں جما دی گئی ہوں۔ صرف ناک، آنکھیں

اور پیشانی گرفت سے آزاد تھیں۔ منہ میں پان بھرا ہوا تھا۔ اس دھج اور اہتمام

سے مولانا صرف کسی بڑے ہی زبردست مسئلہ پر سوچنے کے لئے رونق افروز

ہوا کرتے تھے۔

میں انگریزی پڑھتا جاتا ذاکر صاحب اس کا اردو ترجمہ سناتے جاتے مولانا

کے چہرہ پر شوخی پھیلتی نکھرتی جاتی تھی۔ کچھ دیر بعد ذاکر صاحب اکتا گئے۔ اور بولے

"پانی!" میں نے کتاب بند کر دی، مولنا کرسی پر سے اترے اور کمرہ سے نکل کر باہر پیک ڈالی۔ واپس آئے تو اعصاب کا سارا تناؤ ختم ہو چکا تھا ڈھیلے ڈھالے جھکے ہوئے لیکن ایک "لرزش خفی" کے ساتھ شاداں و فرحاں کمرہ میں داخل ہوئے اور فرمایا "ذاکر، شاد باش و شاد زی! ظالم غضب کرتا ہے افلاطون کو اُردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔ کمبخت بیماری نے کہیں کا نہیں رکھا ورنہ میں بھی ایسا ہی ترجمہ کرتا۔" میں نے کہا مولانا پھر تو افلاطون کا کبھی بیج نہ ہوتا۔" مولانا ہنسے اور جھولنے لگے۔ لیکن اس طور پر کہ افلاطون کی توہین کا مطلق خیال نہ تھا۔ صرف اپنی دلبہی مقصود تھی۔

ذاکر صاحب نے میری طرف "رقیبانہ دیدہ و ہیچ نگفتہ"۔ میں نے کہا "ہاں ذاکر صاحب" "گلاکُن نے کہا" پھر؟" ذاکر صاحب جھنجھلا سے گئے۔ بولے "مولانا یہ سب تو ہوا لیکن یہ رشید صاحب اندوہ گینیاں، شہنائیاں وغیرہ کیسے لکھ ڈالتے ہیں۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا" مولانا میری طرف دیکھ کر ہنس پڑے بولے "خوب کہا یہ لکھنے والے کی نارسائی کی دلیل ہے"۔ میں نے کہا مولانا آپ ذاکر صاحب سے ڈر گئے ورنہ یقیناً صرف اتنا ہی کہتے "نارسائیاں ہیں" غرض بات آئی گئی ہوئی، لیکن یہ لفظ "اندوہگینیاں" اس دن سے چل پڑا۔ اور جہاں کسی کی شاعری یا عشق یا حلیہ پر جلد سے جلد اور مختصر سے مختصر الفاظ میں تبصرہ کرنا ہوتا۔ اس لفظ کو قول فیصل سمجھا جاتا۔ یعنی "کچھ دخل اندوہگینیاں رہے"

Borrower's No.	Issue Date	Borrower's No.	Issue Date